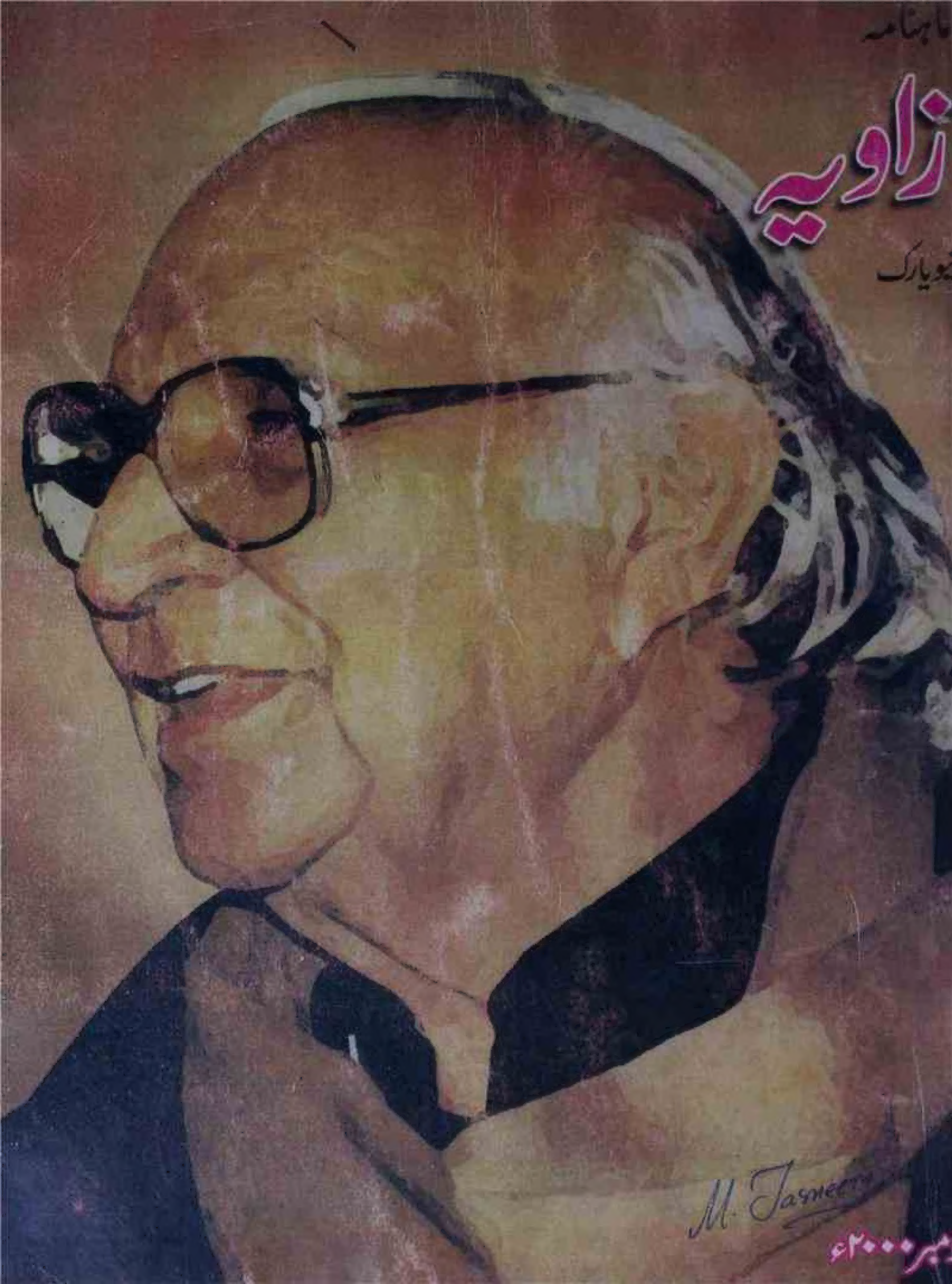


ماہنامہ

زاویہ

نویارک



M. Jameel

میر ۲۰۰۰ء

عالم میں انتخاب
پشاور



تصنیف و تالیف
ڈاکٹر سید امجد حسین

”یک شہر آلودہ“

کے بعد

ڈاکٹر سید امجد حسین

کی دوسری گرانقدر تالیف

”عالم میں انتخاب“

”ڈاکٹر سید امجد حسین اس تالیفی کارنامے پر آج کے علاوہ آئندہ نسلوں کی بھی تحسین کے مستحق ہیں۔“ احمد ندیم قاسمی



امجد کا عشق صرف Nostalgia تک محدود نہیں، اس نے ایک تخلیق کار کی طرح اس خوشبوؤں کے شہر (پشاور) سے محبت کی ہے..... عموماً یہ کام ”اگلے بندے“ نہیں ہوتا کہ بعض موضوعات اپنے وزن کے اعتبار سے بڑے ادارے یا اکادمیاں ہی کر سکتی ہیں۔ مگر امجد کا عشق..... بدوش فیضی اسی ہمہ کوہ سار را: احمد فراز



ماہنامہ زاویہ نیویارک

مجلس مشاورت:
شوکت صدیقی
منو بھائی
شہاب کاظمی
ڈاکٹر امجد حسین
صوفی مشتاق

مدیر: جواہر میر

ماہنامہ

جلد اوّل.....شماره اوّل

نائب مدیر : وزیرال سومرو
منتظم : مرزا اعظم بیگ
کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ : میاں محمد مدثر
سرورق : شہزاد تسنیم
پبلشر : زاویہ پبلی کیشنز

فون، فیکس : 718-565-8646
قیمت فی پرچہ : 4 ڈالر
سالانہ معہ ڈاک : 60 ڈالر
سمندر پار : 100 ڈالر

رابطہ : Zawia Publications
80-15, 41 Ave, Suite 420
Elmhurst, NY 11373
ای میل : monthlyZavia@altavista.com

حرفِ آغاز

ماہنامہ ”زلویہ“ کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ہمارا آپ کی رائے سے متفق ہونا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ ایک آدھ غلطی کے ارتکاب کا حق تو بھی کو حاصل ہوتا ہے اور ہمیں تو یہ اعتراف کر لینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ اس شمارے میں ہم وہ سب کچھ پیش نہیں کر سکے جو پیش کرنا چاہتے تھے، سچی بات ہے یہ ممکن بھی نہ تھا۔

آپ اسے ایک تجربہ یا تجربے کی ابتداء کہہ سکتے ہیں، ایک ایسے تجربے کی ابتداء جو محض ایک ادنیٰ پرچہ شائع کر دینے کے شوق تک محدود نہیں، جو اس جذبے کا حاصل ہے کہ پاکستان اور پیر وین پاکستان اردو شعر و ادب کے قارئین کو عالمی (عصری) شعر و ادب اور تخلیق کے رجحانات اور میلانات سے آگاہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت سے شائع ہونے والے مؤقر جرائد نے حتی المقدور یہ فرض پہلے ہی ادا کر چھوڑا ہے۔ ہمارے تجربے کیلئے غالباً یہی کچھ رہ گیا ہے کہ ہم ماہنامہ ”زلویہ“ میں تازہ ترین امریکی، لاطینی، یورپی، افریقی اور دیگر خطوں کا منتخب ادب، اردو شعر و ادب کے پہلو پہ پیش کریں اور سیاسی، ثقافتی، نسلی، لسانی، تاریخی اور جغرافیائی تضادات سے ماوراء انسان کی فکری (سماجی یا معاشرتی حوالے سے) وحدت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس یقین کے ساتھ کہ یونان اور پاکستان کا درمیانی فاصلہ ایک عام یونانی اور پاکستانی کے درمیان حائل نہیں ہے۔ امریکہ کے اریزونا کے دشت اور سندھ کے میر پور خاص کے دلدلی صحراؤں میں رہنے والوں میں کوئی تضاد نہیں۔ شمالی کیرولائنا کے کسانوں اور جنوبی پنجاب اور ڈیرہ اسماعیل خان کے کسانوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ نیویارک شہر کے کوڑے دانوں میں سے روٹی کا کلز اور کوکا کولا کے دو گھونٹ تلاش کرنے والوں اور پاکستان کے ٹھنڈے چولہوں پر فاقے سینکنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مارکیٹ اکالومی کی طلائی زنجیروں میں جکڑے ہوئے امریکی اور پاکستانی تاجروں، سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور اجارہ داروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

یہ بتانا تو یاد ہی نہیں رہا کہ ماہنامہ ”زلویہ“ ایک غیر جانبدار جریدہ نہ ہوگا، یہ جانبدار ہوگا اور دنیا بھر کے مظلوموں کا طرفدار ہوگا، انسانی حقوق کی آواز ہوگا کیونکہ ہمارے نزدیک ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم،

فیضیاب اور محروم کے درمیان غیر جانبداری، ظالموں اور حاکموں کے جرائم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ اور تجربے کا یہ معیار کوئی پہلا اور نیا معیار نہیں، دنیا کے ادب میں یہ معیار صدیوں پہلے سے قائم چلا آرہا ہے۔

اس شمارے میں نیویارک کے حلقہ کرباب ذوق اور مقامی ادیبوں اور شاعروں کیلئے جناب سید ضمیر جعفری مرحوم کی شفقت اور محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے اپنی سانسوں کی آخری پونجی اسی شہر میں لٹائی تھی۔ سوان کی یادوں کا چراغ روشن رکھنے کیلئے ماہنامہ ”زلویہ“ کی لہداء انہیں کے نام نامی سے کرنی مناسب تھی۔ اس شمارے میں ماہنامہ چار سوا، ادب لطیف اور روزنامہ پاکستان سے استفادہ کیلئے یہ دل سے شکر گزار ہیں۔

اس شمارے میں جناب شباب کاظمی کا مٹھار توں کی صنف گم گشت کے بارے میں تحقیقی مقالہ ”چیتان“ بہت فکر انگیز اور دلچسپ تحریر ہے۔ جناب شباب کاظمی نے اس بھولی بھری صنف شاعری کی اہمیت پر سیر حاصل صحت کی ہے۔ تاریخ ادب اردو میں اس صنف شاعری کا بہت سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے حالانکہ اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے یہ زیادہ توجہ کی مستحق تھی۔

تنازعات کے بارے میں کچھ ایسی تحریریں جمع کی گئی ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ اختلاف رائے کو دعوت دے سکتی ہیں۔ اختلاف رائے کی ہمیں ضرورت بھی ہے کہ اس سے اتفاق رائے کی شعوری خواہش جنم لیتی ہے جو اتفاق رائے کے جبری تقاضوں سے مختلف اور بہر نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس باب میں قارئین کی آراء کا احترام کیا جائے گا اور ایسی تحریروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی جو ہمیں سچائی کے اظہار اور سچائی کی تلاش میں مدد دے سکیں۔

کتلیات کے باب میں ظاہر ہے کتلوں پر تبصرے ہی کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر تبصروں کیلئے کتاہیں بھوانے کی استدعا کی جاتی ہے مگر ہم اس تکلف کی پابندی نہ کریں گے۔ ہم کسی بھی مطلوبہ تحریر پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جس سے کسی کا متعلق ہونا ضروری نہ ہوگا۔

ترتیب

یادش خمیر

10	آپ کا خمیر
12	اسلام آباد کا خمیر
14	سید خمیر جعفری کی یاد میں
16	سید خمیر جعفری سے ایک ملاقات
19	خمیر جعفری مافی الصمیر کے آئینے میں
23	بیاد سید خمیر جعفری
28	جان محفل قضاہ اچھے خمیر
31	سو گئے داستان کتے کتے
32	بیاد خمیر جعفری (نظم)
33	غزل
36	علامہ اقبال سے ٹیلی فون پر بات
37	خلوط (منام): اشرف میاں منام: جوہر میر منام: آغا جان امجد حسین

مضامین

46	پہستان اور پسلیوں کی شاعری (ایک تحقیقی جائزہ)
59	عبد یوسفی اور یحییٰ بن ولید کی چھاؤں
62	شاعر ادیب اور میڈیا

غزلیں

68	احمد فراز
70	افتخار نسیم
72	علیم قریشی
72	اشرف میاں
73	شباب کاظمی
74	عشق لالہ پوری
74	انور شعور
75	عباس تاش
75	حسن علیہ
76	ریحانہ قرمر
76	شوکت جمی
77	رند میر سنگھ

افسانے

80	ڈاکٹر سٹیہ پال آئند	انکس پمیل کا چراگ
83	ارشاد احمد مدنی	صلیب لامت
93	امر محبوب نیچہ	چوٹیوں کی قطار
95	انکار نسیم	ایک تھی لڑکی

تفصیل

100	ڈاکٹر سٹیہ پال آئند	ستہ پال آئند
102	انکار نسیم	انکار نسیم
102	گوہر سلطانہ عظمیٰ	گوہر سلطانہ عظمیٰ
103	شیخ لیاذ	شیخ لیاذ
103	منصورہ احمد	منصورہ احمد
104	شمیر بلیدی	شمیر بلیدی
105	ربحانہ قر	ربحانہ قر
107	حسن بھٹی	حسن بھٹی
106	احمد سلیم	احمد سلیم

تنازعات

110	جوہر میر	منیر نیازی ایک خود غلط
112	ناصر زیدی	علامہ نعیر حسین باظم کیلئے 10 ہزار روپے العام کی پیکش
114	ناصر زیدی	خیال کا سفر یا تو ارد؟
116	جوہر میر	پروین شاکر پر ظلم

کتابیات

120	پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق	نویادک میرے آگے ہر ایک نظر
122	پروفیسر اشرف ظادی	اردو پوٹاؤ کی ایک تاریخ

یادش بخیر

اللہ جلے ضمیر جعفری مرحوم اپنے نیکو کا انتقام بیٹھ انہی تین لفظوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ گزشتہ تقریر یاد دلاوے ان کے جوان کارہنہ ہماری آپ کی اس دنیا سے کم و بیش منقطع ہو چکا تھا اور وہ بول غالب اس طرح زندہ تھے کہ ۔

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مگر اردو ادب پر بالعموم اور اس کی مزایہ شاعری پر بالخصوص جو اثرات سید ضمیر جعفری مرحوم نے مرتب کئے ہیں وہ انہیں اکبر الہادی کے بعد اردو مزایہ شاعری کا سب سے زیادہ اثر قرار دیئے کیلئے بہت کافی ہیں۔ جہاں تک ان کی تنجید و شاعری اور نثر کا تعلق ہے اس کا مزاج و مقام ایسا ہے کہ اگر جعفری صاحب مزایہ شاعری نہ بھی کرتے تب بھی ان کا شمار اپنے صنف کے کچھ وادوں کی پہلی صف میں ہی ہوتا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کثیر الجمعات ہونے کے ساتھ ساتھ بلا فوہیں اور زہد فوہیں بھی ہو اور اس کے باوجود اس کی تحریر کا معیار بیٹھ اور ہر جہت میں بلند رہے۔ یہاں تک کہ ان کی غیر رسمی، مختصر و اندری کے لائق بھی جو ان کی ذاتی یادداشتوں پر مبنی اور مشتمل ہیں اور نہ لورم آصف محمود کی وساطت سے گزشتہ دنوں کتابی شکل میں سامنے آئے ہیں اپنے اندر ایسی کشش، جاذبیت، صوری بلندی اور بے ساختگی رکھتے ہیں کہ انہیں بلا آکھٹے اعلیٰ ادبی تحریروں اور نثریادوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ بے ساختگی سے یاد آئے کہ 1982ء میں شام بہار نو سٹ انبالہ والے راجندر منو ترہ کے مشاعرے میں ہم ان کے ہم سفر تھے وہ اپنے بھاری بھر کم جیے کے باوجود ہنس اور جسنائی سچ پر اٹھائی چاق و چمدن تھے اور اپنے مونہ کے بارے میں اس خوشدلی اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے کہ ہم نے بھی شہ پاکر مولے لوگوں کے بارے میں کچھ لگائے ہیں کر دینے نہ صرف یہ کہ انہوں نے دل بھر منہ کھول کر ان کی دلا دی بدھ اسی حوالے سے ایک اپنا شعر بھی بنا کر ۔

یہ بلا جھپٹا تو مجھ کو خدا نے دیا
ہے مہلا مگر میرا خود ساختہ

اسی سفر کے دوران انہوں نے عطاء الحق قاسمی اور ہمارے بارے میں وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ ”نکلا ہے جب تم دونوں کو پہلے ہادی کیلئے کوئی تیسرا نہیں ملتا تو تم ایک دوسرے کو ہی جتھہ مطلق بنا کر آپس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے رہتے ہو۔“
ضمیر جعفری مرحوم ایک بلند سطح آدمی تھے۔ شرفی، شہرارت اور جملے بازی ان کی شخصیت

اور فن دونوں کا طرہ امتیاز تھا مگر اس کے باوجود ذاتی سطح پر وہ بولی تو اب اور رشتوں کے احترام اور تقدس کے غیر معمولی طور پر بچاؤں تھے۔ فوج کی ملازمت نے ان کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا سچلن اور حفظ مراتب کا احساس پیدا کر دیا تھا جس کو ایک عقیم مزاج نگار کی فطری بے ساختگی کے ساتھ ساتھ چاہے ممکن کی حد تک مشکل تھا مگر جعفری صاحب نے زندگی بھر آگ اور پانی کے اس میل کو جس طرح بھینچا اور جاری رکھا یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا جوہر تھا جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اپنی 83 سالہ بھرپور زندگی میں جو کم و بیش پبلی جگہ عقیم سے لے کر اس صنفی کے آخری برس تک جاری رہی انہوں نے بہت دنیا دیکھی۔ اس کے خلیب و فراخ کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور اس کے ہر ہر دور کو اپنی تحریروں میں اپنے تاثرات کے ساتھ محفوظ کر دیا ان کے لکھنے ہونے واقعات اور کردار ایسے ہیں کہ ان کی قلم کی نوک پر آنے کے بعد خواندہ ان میں ایک طرح کی دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ”اردو سچ“ کے تازہ شمارے میں جو ایک طویل قسط کے بعد ان کی گھرائی میں دوبارہ شائع ہوا ہے انہوں نے ”پہلی و جنگ“ کے زیر عنوان اپنے گاہوں سے متعلق ابتدائی یادوں کو قلم بند کیا ہے یوں تو یہ ہماری تحریر لا ادب ہے لیکن اس میں جن دور و چارہ فونی دور گوں کا نقش انہوں نے کھینچا ہے وہ ایسا ہے کہ اردو خاک نگاری میں اس پائے کی تحریریں شاید ایک ہاتھ کی انگلیوں پر آجائیں۔

ہمارا ضمیر صاحب سے نیاز مند کی کا شرف تقریراً تیس برس پر محیط ہے اس سارے عرصے میں ہم نے انہیں ایک اعلیٰ تخلیقی شخصیت، بلند پایہ انسان اور انتہائی مشفق سنیر پایا ہے۔ بزرگ اس لئے نہیں کہ ان کا وہ عمر اور درجے کے اعتبار سے تو یقیناً ہمارے بزرگ تھے مگر اپنے جو نیرز کے درمیان وہ اس طرح رہتے تھے کہ ان کی محبت، بے تکلفی اور طبعی شگفتگی کا ہاں اس فرق کو دور میدان سے گزرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

چند برس قبل ہر گودھا کے ایک مشاعرہ میں وہ لفظی سے ہمارے جوتے کا ایک پاؤں بٹن کر پلے گئے جو کئی دن کی تلاش اسباب اور ہمارے دوست چودھری افتخار احمد (جوان دنوں وہاں ایس بی پولیس تھے) کی کوششوں سے معلوم اور پایا۔ ہوا ہم نے ایک ملاقات میں جعفری صاحب سے پوچھا کہ آپ کا جو تاخیر تھے والا تھا اور ہمارے تھے والا، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ کو مبالغہ ہو گیا۔ اپنے پیٹ پر ہاتھ بھیر کر بولے اس پبلی بیٹ کی وجہ سے کہ یہ کم گفت گئی رسول سے ہمارے اور ہمارے بچوں کے نیچے واقع دھرتی کے درمیان دیوار بنا ہوا ہے۔ دونوں جوتے ساتھ ساتھ ہڑے تھے کسی حقیقت مند کو آؤ گراف دینے کے دوران دھیمان جوتوں سے ہٹ گیا اور چمکے منہ کی وجہ سے چال ویسے ہی ”افغان و خوجا“ ہے اس لئے گھر بھی کر جو جا ہارے سے پہلے یہی نہیں چل سکا کہ ہم نے کیا پرنا ہوا ہے۔ پھر منکر آکر بولے ”بچیں اب اسی رہا نے ہم دونوں جو ہڈی ہڈی بن گئے ہیں۔“

حضرت شعر و غزل پر گزشتہ دو سو سال سے ہماری پڑتے ہیں لیکن مغربی مادی کی ریت سے دیکھا ایک پر اس قدر غم ہو گیا ہے۔ میرے کہنا تھا ۔

مصاب اور تھے پر آدل کا جانا
جب اک ساتھ سا ہو گیا ہے

سوسیدہ طمیر جعفری جو ہمارے درمیان ہمارے "ضمیر" کی طرح سے زکوہ تھے، جنسانی طور پر تو ہم سے جدا ہو گئے ہیں مگر ان کی سدا بہار اور نام کی آموختگیوں میں جینا ہمارے ضمیروں کو زندہ اور خوبصورت رکھیں گی کہ ہولِ اقبال ۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

دقائق سے چند ماہ قبل انہوں نے اسلام آباد میں طویل قیام کے بعد ریت سڑ پانچ حلقہ دو دو حلقے کے دن (جن کا تعلق صرف ان کے جسم سے تھا کہ ذہن اور قلم کی سطح پر دو لب بھی ہو انہوں کو شرماتے تھے) اپنے گاہوں کی فضا اور بیٹوں اور ان کی اولادوں کے درمیان کڑی رہیں۔ اس موقع پر انہوں نے جو نظم لکھی تھی اس کے چند شعر غزلیہ تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے اسلام آباد میں ایک استوار و تھا، دراصل دو ہم سب کو غدا انا تھا کہ رہے تھے۔

دوم یادیں آلودہ، شہر نکاروں آلودہ
ابے سوار، مریاں، دو حیدر ال، آلودہ

مرطوبی راتوں کی، مہموں کی بوائی اس نے دی
مجھ کو میری مادی ہو زنگانی اس نے دی

تیرے دنوں کے شہر اشوک تھا جاہاں کا
تیرے دیوانے سوال کے ساتھ رہتا جاہاں کا

شام رخصت آگلی اس شہر خوشی دقات سے
میں نے رگی جس کی ہولی افسانہ اپنے ہاتھ سے

پھر نہ ہو آہیں کے وہ دم یاد آئے بہت
وقت جب تم رو گیا تو کام یاد آئے بہت

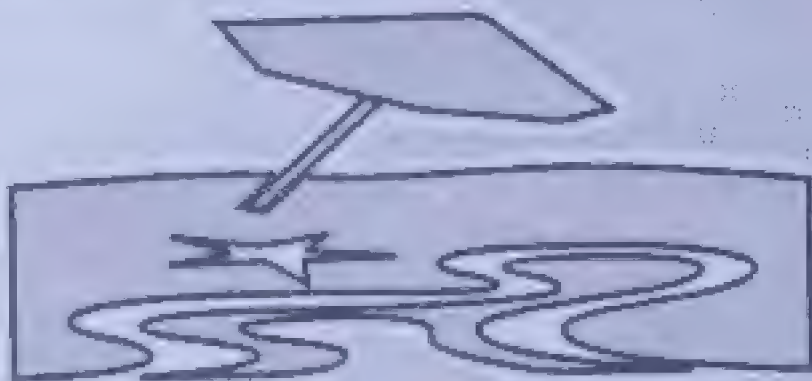
جانا مشکل تھا پر اک مٹھ کر بلاتا ہے مجھے
ماں کا آنگن، ایک کپا کمر بلاتا ہے مجھے

ساتھ نکلی تاش ہم لے جاہاں کا میں
کتنے چہرے، کتنے خواب اور ہم لے جاہاں کا میں

نقد گویان خوش القافہ، خوش انداز، سلام
میرے خوابوں پر نہتے موسم باران، سلام

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

غزلیات فارسی غالب



ڈاکٹر خالد حمید (ایڈیٹر)



منظوم، اردو و ترکی

اسلام آباد کا ضمیر

رشید شاد

اسلام آباد جب آباد نہیں تھا۔ ابھی اس کے بلیو پرنٹ چار ہو رہے تھے، رنگ دار کاغذات کے بچے منظر میں پاکستان کا ”ضمیر“ بھی ہلکی ہلکی روشنی کی صورت میں موجود تھا۔ جب اسلام آباد کی آبادی شروع ہوئی تو پاکستانی ”ضمیر“ اور ان حکومت کے ترقیاتی ادارے میں نظریاتی حرکت کی ذمہ داریاں کراہل پاکستان کی اجتماعی تمامیت کی گرفتار رہا۔

اسلام آباد قریب مسلم گٹ کا مرکزی شہر ہے۔ اس شہر کے بارے میں عربی شاعر اعلیٰ نے انکشاف فرمایا کہ دھنکی صدی بعد میں ایک شہر آباد ہو گا جو پوری مسلم دنیا کے اجتماعی جذبات کی تمامیت کی گڑھ بنے گا۔ یہ شہر آباد ہو گیا اور چشمن کوئی بھی پوری ہو گی۔

اس شہر کو نظریاتی بنانے میں مذکورہ پاکستانی ضمیر کی ادنیٰ فنکاری اور عملی ہمت کاری نے ایک گت کا آئینہ دکھایا ہے۔ چنانچہ لوب، سماج، زندگی، روحی اور ضمیر کے معاملے میں اسلام کے ضمیر کی جانکاری کو اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

پاکستانی عملی جگر کھپادی ناصر سید ضمیر جعفری ہے جس نے پیدائش سے لے کر اسلام آباد کو شہر اوداع کئے وقت جلی انظر اور داخلی حقیقت کو بنا جتم دیا۔ سید ضمیر جعفری CDA کا ڈائریکٹر انظر میشن تھا تو اس وقت بھی اس نے شہر کے خوش آمد مستقبل کیلئے بھی پسپائی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اسی بات تو یہ ہے کہ ایک تھا ذہن نے اسلام آباد کو جسمانی شہر اور مکمل اسلامی تصور عطا کیا تھا۔

سید ضمیر جعفری کو اپنی لوہاں مٹری میں دیکھا تو اس وقت بھی وہ درگاہ و کمالی دینے ہوئے تھے، ذہنی اویوں کے بیچ و مرشد تھے اللہ پر کہ وہ ان کا قدم چومیں تھا وہ ایک رکھ رکھا کے ساتھ انسان کے اجتماعی جذبات کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ پاکستانی لوب میں بیٹھ نیا بننے لگے کرتے رہے۔ پرانے چٹائی پونچھواری الفاظ کو موتیوں کی طرح جڑتے تھے اور لفظ کو Coin کر کے معنی کو وقت کی قید سے آزاد کر دیتے تھے۔

انہوں نے مزاج سے زیادہ سنجیدہ لوب لکھا مگر انہیں شہر سے الٹا کے Epic Culture کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ وہ جب فوج میں تھے تو ان کی دو تہا سو بیس حضرات کے ساتھ تھی اور جب وہ سو بیس ہو گئے تو ان کے انبیاب میں فوجی سرپرست تھے۔ ان اسباب میں بریکنگ جگہ اور گرتی گرتی خانہ داری شہر تہہ رکھتے ہیں۔ مگر ایک اہم نکتہ یہ کہ ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور وہ جگہ بدرگاہ کی حیثیت سے فوجیوں، کونزوں اور محاکموں کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھے۔ چنانچہ سید ضمیر جعفری، احمد منقرہ شخصیت ہیں جن کی جاذبیت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا تاہم انہیں یہ جاذبیت محض ذہنی اور صلاحیتوں کی بنا پر حاصل نہ ہوئی تھی اپنی شخصیت کی انفرادیت انہوں نے خود تشکیل کی تھی اور اپنا لہجہ خود پیدا کیا تھا۔ ان کی شخصی خصوصیت اپنے گھر سے پن کی شہر تہہ رکھتی تھی لہذا ان کے جسم و بیان میں کوئی تضاد نہیں تھا اور نہ ہی وہ فکری اختلاف رکھتے تھے البتہ

منبع شدہ صورتیں، غلام معاشرتی انتظامات اور بدحواسیاں انہیں زیادہ مرغوب رہیں۔ لہذا انہوں نے شاعری کے حوالے سے ایک ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔ انہوں نے ان طریقہ ان کی شاعری Depression کے خلاف ایک تحریک کی صورت اختیار کرتے رہی اور اب ان کا مزاج ناقابل فراموش بن کر ادبی اثرات اور میلانات کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

سید ضمیر جعفری جنت اجتماعی سے الگ تھلک تھے ان کے اندر ایک نرہ انسان پنچا ہوا تھا۔ جس نے انہیں ایک خاص تمدن اور ماحول میں قید کر رکھا تھا۔ لہذا احمد العزیز حضرت، عزیز ملک، نذیر شیخ سے ان کی محبت لافانی تھی۔ اور جب وہ ترتیب و حسین کی بات کرتے تو موانہ چراغ حسن حسرت کو بیچ و مرشد کہہ کر انہیں مزاج پیش کرتے مگر مولانا حسرت کو بیچ و مرشد کہنے والا ضمیر ایک دن بذات خود بیچ و مرشد تسلیم کیا گیا اور یہ کتنی عظمت کی بات ہے کہ اپنے عہد میں سید ضمیر جعفری نے پر ختم زندگی سہی ہے۔

سید ضمیر جعفری نے کئی لوہا دیکھے۔ بہت سے عہد بہت سی شخصیات اور ممالک کی سیر کی۔ لہذا ان کی شخصیت میں نسلوں کے تجربات اور ترقی و تہذیب کے نامیاتی عناصر مل جاتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ شاید ہی اردو انسان تھے کہ انہوں نے اپنے لئے لفظی زیر می خود قید کی تھی۔ اور جب اپنی ضرورتوں کو سمیٹنے کا وقت آیا تو اسلام آباد کو اوداع کہنے میں انہوں نے کوئی پیچیدہ محسوس نہیں کی۔ سید ضمیر جعفری اپنے دوستوں، ہم جنوں اور ہم عصر دل کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی Complex نہیں تھا۔ یہ تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کا جی کھول کر اظہار کرتے اور خوش اسلوبی کے ساتھ فن اور اقدار کو تحفظ دیتے جو تک وہ صندب انسان تھے اور خانہ داری اقدار سے آسودہ حال لہذا ان کے فکر و احساس میں ذاتی مسرت، فراغت اور آزادی کی پلنگت بنائی رہتی تھی۔ ان کی زندگی کی ترکیب میں انظر اور نہیں، کھل فہم اور ایک ناموس موجود تھا۔ لہذا وہ ہر چار زندگی کے ساتھ اپنے عہد کو نشانہ کرتے رہے ہیں۔

وہ جب تمام مفروضوں کو چھوڑ کر اسلام آباد میں رہائش پذیر ہو گئے تو ان کی زندگی طبعی آہنگ کا درجہ اختیار کر گئی کیونکہ وہ زندگی کی تمام اہلک مختلف تجربات کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ کسی Walk کا معاملہ ہو یا ضمیر کا ضمیر وہ غیر ارادوں طور پر چٹوں اور کاروائیوں کے سرخیل بنائے جاتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی الجھن، کسی شے، کسی ادبی تصور کو مطالعہ نہیں بنایا اور اپنے بیچ و مرشد چراغ حسن حسرت کی طرح تمام عالم کو حسن، حقیقت اور خیر تقسیم کرتے رہے۔ اسی طرح انہیں اسلام آباد کے واحد فرد کی حیثیت میں لایعنی اور مرکب بنالیا۔ Image حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسلام آباد کے منقرہ انسان تھے (اس لحاظ سے انہیں اسلام آباد کا ضمیر کہا جاسکتا ہے)

ان کی شخصیت اور زندگی کو فکری کایہ شہر عید ہے

جہاں غصے زائل ست و غما و عارض و خال
جزا نکلتے دریں کاروبار و دلدل لیت

ماہنامہ زاویہ

آئندہ شمارے میں

مرزا غالب کا قمار خانہ

چوہدری اصغر علی کوثر

نثری مہتمم (نگار خانہ)

سنسکرت شاعر: راموور گپت کی مشہور نظم

ترجمہ: میراجی

دیباچہ: سعادت حسن منٹو

اردو افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ

ڈاکٹر اعجاز راہی

افسانے

رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی،

منشایاد، امر محبوب ٹیپو

نظمیں، غزلیں

تنازعات اور کتابیات

سید ضمیر جعفری کے بطور اسلام آباد اس طرح ہے جیسے ذہن اپنے ضمیر سے خالی۔ لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید ضمیر جعفری کے بطور اسلام آباد اپنی بابت کی کوئی قرار رکھ سکتا ہے کہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اسلام آباد کا دوسرا اہم نامہ "ضمیر" ہے چنانچہ ایک روحانی تصرف کی روشنی میں کسی عالم مثال کو تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اسلام آباد جسے لوگ "گوفہ" کہتے ہوئے نہیں سمجھتے اور اسے شہر ہجڑاں کا خطاب دے کر اپنے شعوبہ روحانی اور Depression کا اظہار کرتے ہیں۔ "گوفہ" کے عالم میں اس شہر ہجڑاں نے ایک زندہ Legend کو الوداعی سلام پیش کر کے ایک اعلیٰ روایت کو قائم کیا ہے۔ یہ نئی مثال اس لئے بھی یادگار ہے کہ اسلام آباد فطری تقاضوں سے آشنا نہیں ہے یہاں تقاضے بھی شہر انہوں کے ہیں اور گماشتے بھی انہیں کے ہیں۔ مگر سید ضمیر جعفری نے جب الوداعی سلام کا لہو لہو کیا تو شہر انہوں سے زیادہ ان سے محبت کرنے والے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر انہیں خراج تحسین پیش کر کے الوداع کہا تو اب تک اسی محبت کے آئینے میں اسلام آباد کو نگاہ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اسلام آباد کے الوداعی لہروں سے ابھی تک کوئی دوسرا روحی ضمیر جعفری کی ویت میں جنم نہیں لے سکا۔ حالانکہ وہی کشت پر نمودار ہے اور وہی لالہ زار اسلام آباد ہے۔ بیدل نے کہا تھا :-

صد قہر و سوچ کو طوفان گرد
نزد دریا گوہری لیلیاں گرد
فطرت مری کند تک و ساز ہوس
تا نقش لب سے و انسان گرد

ان شعرا کی روشنی میں سید ضمیر جعفری زندہ ہلچل و حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کا مزاج اور فطری تخلیقات فطرت انسانی کی گہرائی میں اتر جاتی ہیں۔ اس طرح وہ بذات خود عصر موجود کی ہندو شوں سے آزاد ہندو زمان و مکالم کی جدید یوناس سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ آج اسلام آباد اپنے عروج پر دو جہان پائی کا باعث ہے۔ اس نئے الاقوامی شہر میں سید ضمیر جعفری کا نام ادب، صحافت اور تصوف کی زندہ علامت کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ مگر سید ضمیر جعفری کی وفات سے اس شہر کے رموز اور خیالوں میں سنائے کی آواز گونج رہی ہے۔ دوست و شریک کی چمک پھل، علوم و فنون کی دھماکی دیکھ باطنی ستارے کی آواز پڑھو، یا ہر کی ہر کشت بھی سنائی دے رہی ہے۔ اہل پاکستان محبت کرنے والے ایک انسان سے محروم ہو گئے ہیں۔

مانے نی میں کنوں دسہاں دور و پنجوڑے را مال

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

سید ضمیر جعفری کی یاد میں

نسیم سحر

سید ضمیر حسین شاہ ولد سید حیدر شاہ ضلع جہلم کے ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش مورخہ 1917ء تکس گئی ہے مگر یہ حتمی تاریخ ان کے لئے نہیں کہ خود انہوں نے ضمیر جعفری "بہاری پیدائش کی تین سو پچیس سنے میں آتی رہیں۔ دو سو پچیس 1915ء میں اور ایک 1916ء میں۔ صیبت کسی کو یاد نہیں رہا۔ آخر یکم جنوری 1917ء اختیار کر لیا گیا۔ اب ہمیں یکم جنوری 1916ء اور کسی یکم جنوری 1917ء لکھا ملتا ہے۔ آپ نے لورنڈل کا امتحان گاؤں ہی سے پاس کیا، میٹرک جہلم سے، ایف اے فلک سے نور علی اب انعامیہ کالج لاہور سے۔ آپ کے دو رنگ ایروں سے پسے مکان آئے یہ کوئی تین سو برس قبل کی بات ہے پھر وہاں سے آکر اس جگہوں میں آباد ہو گئے اور اب بھی وہیں آباد ہیں۔ ضمیر جعفری کہتے ہیں "بہارے خاندان پر اتفاقاً روشن نہیں کیا ہی نہیں کہ زوال بھی آئے"۔

ضمیر جعفری نے حصول تعلیم کے بعد ضلع لکڑی اختیار کیا، پھر حکومت ہند میں ذوالوچے رہے کی لکڑی کی۔ جنگ عظیم دوم پھڑی تو فوج میں بھرتی ہو گئے اور پاکستان کے عہدے پر فائز ہو کر جنوب مشرقی ایشیائی ممالک (بمبئی کو لورنڈل کا پور) میں تعینات ہوئے۔ آپ کا تعلق شعبہ تعلقات عامہ سے تھا جس میں ان دنوں حکومت پاکستان نے بہترین شاعر اور ادیب اکٹھے کئے ہوئے تھے مثلاً مجید ملک، کرمل فیض احمد فیض، میجر جے ایف حسن حسرت، ٹیپٹن ان ام راشد، میجر آغا بدر، کرمل مسعود احمد اور گناہر حسن عسکری (ابن سعید)۔ 1948ء میں پاکستان (ابن آئے۔ 1949ء میں کپٹانی سے استعفیٰ دے دیا اور رولپنڈی سے کرمل مسعود احمد اور ٹیپٹن انعام جعفری کی شرکت میں ایک روزہ اخبار "بازنہال" جاری کیا مگر وہاں اشرافیوں کی وجہ سے ایک برس تک بھی نہ چل سکا۔ پھر 1951ء میں آپ کو سیاست میں جانے کی سوجھی اور جہلم کے دیہاتی علاقے سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے مگر ہار گئے اور پھر پھر سیاست کے خاندان میں قدم رکھتے کا نام نہیں لیا۔ اور 1952ء میں دوبارہ فوج میں کیمپن لے لیا جہاں سے 1966ء میں میجر کے رینک سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ فوج میں ملازمت کے پہلے دور میں آپ نے 1948ء میں جنگ ضمیر میں اور دوسرے 1965ء کی جنگ ضمیر میں عسکری خدمات سر انجام دیں۔ 1966ء میں آپ دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے سی ڈی ای میں ڈائریکٹر شعبہ تعلقات عامہ مقرر ہوئے۔ چند برس تک آپ نے اس حیثیت میں اہم خدمات سر انجام دیں۔ پھر کچھ عرصہ آرمی گرنے کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان سے بڑے تواناں ممتاز بن کے چلے گئے میں ضمیر رہے۔ ان کی ادبیات پاکستان سے بھی وابستہ رہے اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا دوبارہ وقت اولیٰ سرگرمیوں کیلئے وقف کر دیا۔ ان دنوں ان کا قیام اسلام آباد میں ہی رہا مگر عمر بھر کی محنت کے پانچ سو ادبی ورثے

قطرت کے باعث اپنا مکان نہ بنا سکے اور آخر جب وہ اسلام آباد سے اپنے گھر کے پاس کراچی جانے لگے تو اسلام آباد کی تمام اولیٰ عقلموں نے مل کر ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا جس کی یادیں اب توں تازہ رہیں گی۔ کراچی میں وہ اپنے بڑے بچے ڈیگنڈیز سید احتشام ضمیر کے پاس رہے کچھ عرصے کے بعد وہ دوسرے بچے سید اقبال ضمیر کے پاس امریکہ چلے گئے اور وہیں سرطان کی بیماری کا علاج کرا رہے تھے کہ جان جان آفرین کے پیر و کردی۔

آپ کی ادبی خدمات اور آپ کی تمام تصانیف کا احاطہ شاید ایک مضمون میں نہ کیا جاسکے تاہم ذیل میں ان کی شائع شدہ کتب کی ایک فہرست دی جا رہی ہے (جو مکمل نہیں گئی جاسکتی)۔

شاعری

کارزار	کھلیان	بن بلسری
لورنڈل	ارمغان ضمیر	من میل
بازیروں کے گیت	قریہ ہاں	من کے ہر
نعت نذرانہ	بھنور اور بادیاں	کفر شیر خان
ولایتی رقصان	گورنڈ	مائی انصاف
ضمیریات	ضمیر طرافت	نور وطن
مسدس بد حال	من مندوی	پاک فوج کو سلام
نشاۃ تماش	گورنڈ	وہ پھول جس کا نام نہیں

نثر

لڑنے خانے کے (آکسی مضامین)	بند و سزاں میں دوسری	ملايا اور ملايا کے لوگ
تجلی چرے	آفتاب معرفت	جنگ کے رنگ
حرف و حکایت (تالیف)	آزادی خیر (ناول)	گورے کالے سپاہی
آخری سیلوٹ (تالیف)	بھلاپانی	سورج میرے پیچھے (سفر نامہ)
سفر نامہ + خبر نامہ	حلیہ نامہ	ضمیر حاضر ضمیر قائب
نظر غبارے	مشرقی سقوط پاکستان	کنگر دوسریں میں (سفر نامہ)
شیر محمد شاہ (سوانحی خاکہ)	خدا و خال	اوتیا توں کے پار (سفر نامہ)
جاپانی جنگ کی نگوئی	شاہی جج	مارشل لا اپنی آخری منڈی پر

آپ نے اپنی زندگی میں بے شمار ادبی پرچوں کی ادارت کی۔ انہوں نے روزنامہ احسان لاہور

اور مولانا چراغ حسن حسرت کے منفرد ادبی و شعری رویہ "شیرازہ" لاہور کی مجلس ادارت میں شامل ہے۔ ہفت روزہ "سدا بہار" لاہور کے ایڈیٹر ہے۔ روزنامہ "بادشاہ" راولپنڈی تو خود ہی نکالا تھا۔ اس کے علاوہ "نیرنگ خیال" راولپنڈی اور مشہور مزاحیہ ماہی رسالے "کر و بیچ" راولپنڈی کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے راولپنڈی سے شائع ہونے والے ایک خوبصورت دو ماہی ادبی پر ہے "چند سو" کے چیف ایڈیٹر تھے جس کے ایڈیٹر معروف افسانہ نگار گلزار جاوید ان کے روحانی شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ضمیر جعفری نظم و نثر میں بے تحاشا شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاکوں اور مزاحیہ مضامین اور سفر ناموں کے علاوہ ان کا روزنامہ بھی کئی برسوں میں مسلسل شائع ہوتا رہا جس کا عنوان "ضمیر کی ڈائری" تھی۔ جنگ راولپنڈی میں "رولول رنگ" اور "ضمیریات" کے عنوان سے بھی مستقل کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ہول بھٹے آپ نے "طلب بھری" کا بھی ایک لنگر کھول رکھا تھا مگر اپنی بے شمار کتابوں کا دیباچہ لکھتے کیلئے بھی آپ کے پاس وقت نہ تھا۔ اپنے کلام نظم و نثر کو خود ترتیب دینے سے بھی گریز کیا کرتے تھے حالانکہ زندگی بھر میں آپ نے بہت کچھ لکھا۔ دراصل آپ کے اندر درویشی کی صفات انضباط کی طرف سے دور آتی تھیں۔ ان کا سلسلہ پنجابی کے ایک انتہائی مقبول درویش شاعر سلطان العارفین میر سید محمد شاہ صاحب سے ملتا تھا جن کے پنجابی بیانات اور جن کی لکھی ہوئی پیر آزلو کشمیر، پونچھ اور دہلی کے علاقوں میں ہیر وارث شاہ سے بھی زیادہ مقبول ہے اور "پیر دی ہیر" کے عنوان سے یہ تصنیف ان علاقوں کے لوگوں کے دلوں میں رچ کر کن مان کر گونجتی ہے۔ "من کے ہار" کے عنوان سے ضمیر جعفری نے پیر سید محمد شاہ کی اس مقبول ترین کتاب کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ ضمیر جعفری میاں محمد بخش سے بھی بے حد متاثر تھے اور ان کی ادا وال مثنوی "سیف الملوک" کو اردو نظم میں منتقل کرنا بھی آپ کا ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ بنیادی طور پر آپ کو علمی وراثت اپنے دادا سید احمد شاہ سے ملتا ہوئی تھی جو ضلع جہلم کے قلعہ رجتاس کے واحد اور چار بجی مدرسے کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مزاج نگاری کی طرف آنے کی بنیادی وجہ ضمیر کے اپنے کلمے کے مطابق یہ تھی کہ انہوں نے اپنے والد محترم کو ہر بھر کبھی کھٹکھا کر ہنستے نہیں دیکھا جس کے وہ عمل میں مزاج کا جذبہ پر واز چڑھا۔ ان کے شعروں میں لہجے دریاے جہلم کی عطا ہے جو ان کے چمک کے قریب سے گزرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید ضمیر جعفری کی شاعری کے چھتار درست نے زندگی کے عصر میں دور دور تک پھول کر رکھی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں یہ آواز مسلسل، منفرد اور معتبر رہی ہے اور اس نے شعوری طور بھی اور لاشعوری طور پر بھی اپنے بہت سے ہم عصروں اور اپنی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ انہیں لامحدود شہرت حاصل ہوئی ہے اور انہوں نے اپنے ذہن سایہ پر واز چڑھنے والے پودوں کو بھی درخت کا روپ دینے میں ان کی صلاحیتوں کی آبیاری کی اور انہیں آگے بڑھایا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ضمیر جعفری ہر عمل نظم و نثر کی جان اور آہن نور مان رہے ہیں، جہاں بھی گئے پاکستان کی پہچان رہے۔

پاکستان اور کشمیر سے ان کا لگاؤ ایمان کی حد تک شدید ہے۔ یہاں ان کے گھر کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ 1931ء میں جب آپ ابھی انہیں جماعت میں پڑھتے تھے اور آپ کی شاعری کی سب سے پہلی شہرت تھی تو آپ اسکول کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ انہی دنوں کشمیر میں راجہ ہری سنگھ کے خلاف بھی تحریک شروع ہوئی تھی اور جہلم سے کشمیر کی طرف جتے لوگ ہونے لگے جو گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ ضمیر جعفری نے ایک باغیانہ نظم ایسے ہی ایک جلسے میں پڑھی تو یوں یوں پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ اتفاق سے وہاں ایک مسٹرین صاحب موجود تھے جو ان کے کرایہ دار تھے۔ انہوں نے ضمیر جعفری کو بچھڑ کر چھوڑ دیا۔

دیباچہ مگر نظم کے ساتھ ان کا یہ جذباتی تعلق نظم نہیں ہو سکتا، ہفت روزہ "سدا بہار" ان کی مزاحیہ شاعری پر انہیں اکبر الہ آبادی اور اس کے اعلان کیا جس کے ساتھ ایک نظریہ رقم بھی دی جاتی ہے۔ ضمیر جعفری نے کشمیر میں بھارتی حکومت کے کردار پر احتجاجاً ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ پاکستان بننے سے قبل وہ 1936ء میں مشہور لوہ لوہ شخصیت ایوب اور "ہمایوں" کے ایڈیٹر فتح مرید القادر سے "ہمایوں گولڈ میڈل" ملے تھے۔ 1967ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو تمغا قائد اعظم اور 1985ء میں تمغا برائے حسن کارکردگی دیا۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے گاہ کو شہر سے ملانے والی سڑک کا نام ضلع کراچی نے ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

ضمیر جعفری ایک انتہائی وضع دار، شریف النفس اور مرتعناں سرخ شخصیت تھے۔ انہوں نے اگرچہ زیادہ شہرت مزاحیہ شاعری کی وجہ سے پائی مگر جب ان کا سنجیدہ کلام "قریہ جاں" کے عنوان سے شائع ہوا تو سنجیدہ ادبی حلقوں کو بھی چو کا گیا کہ وہاں بھی ان کے کلام کی معنویت اور تمہ داری کا اور ان کی قادر انکاسی کا وہی عالم تھا۔ دراصل بات وہی ہے جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا ہے کہ "جیسے پانی مٹھدا ہو یا گرم بنیادی طور پر پانی ہوتا ہے، اس طرح شاعری مزاحیہ ہو یا سنجیدہ مگر شاعری ہے تو اول ذہن و دل و دماغ کے صحیح عمل اثر کرتی ہے۔ ان کے دونوں انداز کے کلام کو ملا کر دیکھئے تو عہد حاضر کی ایک بھاری بھر کم شخصیت آپ کے سماں بندہ دل میں شعر پڑھتے ہوئے اور ہو گی۔"

ذہن کو مت جت جت دیکھا
یہ تو ہے جنگل میں دست دیکھا

خود ضمیر جعفری اپنے بارے میں ہاتھ بوندے دیتے ہیں۔
"میرا قریہ حلقہ اصحاب واضح طور پر تین گروہوں میں تقسیم ہے، ایک وہ جو میری سنجیدہ شاعری کو پسند اور مزاح کو ناپسند کرتا ہے ایک وہ جو مزاحیہ شاعری کو کار خوش گردانتا ہے اور ایک وہ جو میرے اس سادے عمل ہی کو نکارتا ہے۔"

مگر ظاہر ہے کہ شاعری یا لب اس تیسرے طبقے کیلئے تو لکھی نہیں چاہی۔ ضمیر کی شاعری کا ایک قابل ذکر حصہ قوی یا، طنزی شاعری پر مشتمل ہے اور یہ کوئی لاشعوری رویہ نہیں، شعوری رویہ ہے کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ "آزادی اور سلامتی کیلئے گوارا کا مسئلہ لازمی تو ہوتا ہے لیکن میں گوارا کی آزادی کا حامی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ قلم کی طاقت بھی جنگ ختم کرنے کیلئے استعمال کرتی چاہیے، جنگ کیلئے نہیں۔ قلم سے تو قوی ظالمیں ظلمی جہانیں، قوم کو گرہ لگایا ہے۔"

لہذا یہ کہنا جاسکتا ہے کہ ضمیر جعفری نے اپنی آخری سانس تک قوم کو بھلیا نہیں، گرہ لگایا نہیں اور اسے سنجیدگی سے سچے پر بھی آمادہ کیا۔ اور اب یہی آواز جو عجب محترم ہے جس میں خود اپنے ضمیر اپنا کلام مشاعروں میں پڑھا کر سامعین کو فک و فکاف قلم سے نکالنے پر مجبور کر دیتا تھی ایسے کیلئے خاموشی ہو گئی۔

خاموشی وہ کیا ہے جس کا وہ

ریاض سے چھوڑا اور مضمون مناد وہی قانون تو یہ کیلئے کہہ رہے ہیں راولپنڈی فون کور، ہوں کہ گلزار جاوید کے نظم میں شرکت کر سکیں۔ بعض اوقات ادبی رشتے خاندانی رشتوں سے قریب ہوتے ہیں۔

سید ضمیر جعفری سے ایک ملاقات

ڈاکٹر اعجاز اسی

سید ضمیر جعفری سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ یہ تو اب قصہ پارینہ ہوا۔ مگر ان سے آخری ملاقات اس دن ہوئی۔ جب وہ افتخار عارف کی دعوت پر حقدار و قوی زبان اسلام آباد کے مرکزی دفتر کے ان میں اپنے ہاتھوں سے عوام لکاتے آئے تھے اور افتخار عارف نے ہمیں بھی ادارہ محبت میں سادہ سی تقریب میں۔ جو کر لیا تھا۔ سید ضمیر جعفری ظاہر ایک پورا لکھ رہے تھے۔ حاضرین اپنے ہاتھ اٹھا کر اس پودے کے پھٹے پھولے اور جوان ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے اور آج آپ ضمیر جعفری ہم میں موجود نہیں، تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے وہ ایک پورا انیس لگا رہے تھے بلکہ دانش کا دست ڈھل میں اپنی بہت فکر کا ایک ایسا یا نشین مقرر کر رہے تھے جو ان کے بعد زندگی کی تھنی دوسروں میں گھسری پھٹیں تھیں ان کی ان محبتوں کا سلسلہ وراثہ رکھ سکے، جو وہ مدد و معاونوں کے ساتھ اپنے دوستوں میں تقسیم کر رہے تھے۔

کہتے ہیں جو آنکھ لا بھل ہوا، پر لٹلا بھل ہو جاتا ہے مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھ لا بھل ہوں تو دل میں اثر جاتے ہیں اور جب تک دل چاہے کہ تار سے دو بادوں کے تسلسل میں زندگی کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ ضمیر جعفری بھی ایک ایسے ہی محبت کرنے والے تھے کہ جب تک ان سے محبت کرنے والے زندہ ہیں وہ زندہ رہیں گے۔

میری ضمیر جعفری سے ملاقات کب ہوئی؟ شاید اب یہ یاد کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی، تاہم قریب چائے اور دور ہونے کے سلسلے ایسی رہے کہ ان سے ہر دوسری ملاقات پہلی ملاقاتوں کی تجدید کرتی رہی کہ پھر وہ جہاں بھی ہوتے میری نیاز مند فی طور ان کی شفقت ایک مستقل تعلق خاطر میں رہتی رہی۔

ان کا نام دیر سے میرے ذہن کی زنجیر میں موجود تھا اور پہلی بار پوری شدتوں کے ساتھ اس وقت سامنے آیا جب ایوب خانی بار شمل لاء زوروں پر تھا۔ اسلامی جمعیت علماء اور قومی جمعیت علماء کے درمیان پھیلتی خالی شدت چکڑی چکڑی تھی۔ اسلامی جمعیت کا فکری طاقتور مولانا مودودی کی سوچ سے مرتب تھا اور قومی جمعیت کا لیبر ترقی پسند نظریات سے الگ تھا۔ جس کے پیچھے ابن مفلح، امیرک سچرین حلیہ حسن منور و مصباح الدین جیسے جید سکالر تھے۔ بار شمل لاء کے خلاف وہ محض صرف علماء تک محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ لیبر کی زنجیروں نے پاکستانی سیاستدانوں کی زبانیں اس طرح بند کر دی تھیں جس پر آگے میں نہ بڑھنے کی سی صورت حال کو چھوڑ کر بھڑکنا ہی سہی لگا تھا کہ میں جب چاہوں پاکستانی سیاست کے کردار کو ہم جانتے ہوئے میرے پیچھے چلے گئیں۔ غیر اسلامی جمعیت اور قومی جمعیت کے مابین آجوش اس طرح تھی کہ قومی جمعیت کو "وفا دہاں پر لڑنا پڑ رہا تھا مگر ہم قومی جمعیت دونوں کے ساتھ، رد عمل شدید تھا۔

جب بھی حکومت کے خلاف رد عمل ہو تو وہ عمل کی کمر توڑنے لیتے۔ مگر ان کے ساتھ

مگر قاریاں ایک لازمی جزو ہوتی ہیں۔ قومی جمعیت کے کئی نوجوان گرفتار ہوئے جن میں آج کے ممتاز صحافی الحق دہلوی مرحوم کے ایڈیٹر ارشاد تو بھی تھے۔ انہیں پولیس کی سخت گیری سے گزار کر پنجاب اسمبلی کی بلڈنگ کے ایک کمرے میں جو اس علاقے کے سب بار شمل لاء ایڈمنسٹریٹر کا دفتر تھا پیش کیا گیا۔ جہاں او میز عمر کا ایک کینٹن موجود تھا۔ جس نے پولیس کی طرح سرخ سرخ آنکھیں دکھانے کی جاسکتی شفت سے کرسیوں پر بٹھا دیا اور "نظر یہ ضرورت" کے تحت انہیں سزا سناتے کی جائے کمال پرانہ شفقت سے ملک، قوم اور نوجوان نسل کی ذمہ داریوں پر ایک ٹیگور دیا اور انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ جب ان لوگوں کی ہچکچاہٹیں کھلیں تو وہ حیران، ششدر، کبھی پولیس اور کبھی اس او میز عمر کینٹن کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور انہیں تھانے کے انسپکٹر سے بار شمل لاء کا یہ کینٹن اچھا لگا۔ یہ سید ضمیر جعفری تھے اور یہ کینٹن ضمیر جعفری نہ ہوتے تو شاید انہیں وہ انسپکٹر یاد دہما لگا، جو پھرتول تو کر سکتا تھا سزا انہیں سناتا۔

ضمیر جعفری کے ساتھ یہ میرا پہلا تعارف تھا اور جب یہ غالباً ملاقات باقاعدہ ملاقاتوں میں پہلی تو وہ فوج سے سبکدوش ہو کر سابق میجر بن چکے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات باپیلے بادشاہ قدارف کے محرک ممتاز شاعر اور تیر تک خیال کے مدبر سلطان رشک تھے۔ جن کی دوستی ایک مثال اور سید جعفری سے محبت بے مثال رہی۔ ان کے ہاں ضمیر جعفری سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور پھر یہ سلسلہ عشروں پر پھیلتا چلا گیا۔

مجھے آج زندگی میں پہلی بار یہ مشکل پیش آ رہی ہے کہ میں کسی دوست کے ہارے میں سوچوں کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہنے کو کوئی بات نہ ہو یا پھر اپنی باتیں ہوں کہ ذہن کو گھل کر دوسرے میں دوسری کیفیت کا فکار ہوں۔ کبھی بتی چاہتا ہے کہ میں اپنی بات کا آغاز سلطان رشک کے ہاں اس واقعے سے کروں۔ جب میں اور سلطان رشک دونوں ہی ادب میں نوروں تھے، تو سلطان رشک نے ضمیر جعفری سے میرا تعارف کرنا چاہا تو سید ضمیر جعفری نے درمیان سے ہی بات اٹکائی اور کہا کہ میں حاضر ادب ذوق کے اجلاسوں میں بہت کم جاتا ہوں۔ ایک بار گیا تو یہ صاحب کسی پریوں تنقید کر رہے تھے، جیسے ٹیبل میں پھر ابو الکولی یحیٰ اور فست پر کھڑے پاں چلا رہا ہو اور اسے یہ بھی پتہ نہ چلے کہ درخت کب کا گر چکا ہے۔ یا پھر غنویہ کی اس شام سے انہر آغاز کروں۔ جب میرا خانے میں (سید ضمیر جعفری جو ہر صبر کے گھر کو ہجر و میر اور میر خانہ کہتے تھے) ملے تو ہم دونوں کے درمیان دسوں سے حائل کتاب و اقتیاد کے قلم پر دے کر گئے تھے اور ہم تادیر ان کی عجیب و شاعری سے محظوظ ہوتے رہے۔ اس شام ادبائے ان پر پابندی عائد کر دی تھی کہ ان سے مزاحیہ شاعری کی جائے ان کی "اصل شاعری" سنی جائے گی۔ پھر دو سائے رہے اور ہم سنتے رہے۔ ہم سنتے رہے اور دو سائے رہے۔ میرے

بڑا ایک ضمیر جعفری کا اصل حوالہ ان کی تنقید و غزل کی متعدد جگہوں کو ملتا ہے مختلف ہوتا ہے۔ مگر آپ ان کا ضمیر کی بھی ہے۔

یہ میرا عقیدہ قوی زبان میں ملازمت کا زمانہ تھا ایک بار وہ تشریف لائے تو حسب معمول ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات کے بعد دیگر اصحاب کے کمرہوں سے ہوتے ہوئے میرے کمرے میں بھی پہنچے۔ باتوں باتوں میں میں نے ان سے کہا کہ جب کوئی میری یاد دہانی دیتا تو یہاں ہے تو اس کی نظر میں ایک نئے اور بہتر آفاق و آدرش پر ہوتی ہیں۔ مگر آپ نے مزید شاعری کا یہ گہوارہ کھلا کر رکھا ہے۔ وہ قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ کر آنکھوں سے دیکھتے رہے اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے میں نے خود ہی اپنی بات مکمل کر دی کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور نقاد کے صاحب اسلوب تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے مزید شاعری میں پناہ کیوں لے رکھی ہے۔ میری بات میں انہوں نے کسی کی پشت سے ٹپک لگا کر ایک طویل قصہ لکھا اور پھر تنقید ہو کر وہ لے لوگ ابھی تک مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں میرا جواب تھا، قبلہ لوگ کب پہچانتے ہیں، آپ کی شاعری انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ اس ضمیر جعفری کی تلاش کرتے ہیں جو کہتے ہیں۔

عدت کے بعد اس نے مر اخیمن ضمیر
دیکھا نگار عام سے اور خاص گر دیا

مصلحت کا جو ایسا تھا کہ چپ رہتا تھا
اور اسلوب زمانہ پر بھی اتنی بہت

ایک تو بھی مسرت کا رت ہوتا ہے
تو کہ جیسے کا سلیقہ ہی کہاں رکھتے ہیں

ہر نظر میں اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے طرف تک چلا مجھے

خدا معلوم دل کو جیتو ہے کن چیزوں کی
نہ جانے کن ستاروں کی ضیاء کو دیکھنا ہوں میں

اپنی خبر نہیں ہے جو ہیں خدا مجھے
تک مجھے تھا کہ مل نہ سکا ہر مجھے

ضمیر جعفری اپنے اشعار میری زبان سے سن کر کچھ خاموش رہے اور کہنے، شاید سوچنے لگے ہوں کہ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ اگر شاعری کا رنگ کیوں پال لیا ہے کہ شاعری تو بڑی آسانی کے باعث تو قیام کب تھی۔ یا پھر شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ وہ شخص جو ہر گھر مجھے نہیں مل سکا ہے کیسے مل گیا۔ اور آج کے سولہ صدی میں سوچتا ہوں اور جہ ان ہوتا ہوں کہ ہر ضمیر جعفری نے اس ضمیر جعفری کو مزید شاعری کی سلیب پر کیوں چڑھا دیا تھا۔ کیا انھیں شعر سے لپٹے اشر سے کیلئے تو چیزوں کے گیت بھی کافی تھے اور کہیاں تھیں۔ ضمیر میں نے جعفری صاحب سے کہا کہ وہ شخص جو آپ کو ہر گھر نہیں ملتا تھا مجھے لگتا ہے کہ اسے تو

آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ لہذا وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ آپ کو کہیں ملے گا۔ انہوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد ایک دنگی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پلو پنوں زاد ہے۔ وہ مجھے ملے نہ ملے یہ تو یقیناً وہ الگ وہ مظلوم ہاتھوں میں ہے۔ تو میں نے کہا مجھے وہ ہاتھوں میں نہیں ملوں میں۔

ضمیر جعفری قوی تھے مگر الگ بارگاہیوں کے اندام میں کہتے۔ زمین فتح کرتے تو دل بھی ضمیر کو لپٹے۔ 1987ء کے نو افر میں انہوں نے امریکہ پر چڑھائی کر دی اور 52 میں سے کم از کم نصف دستوں میں جھڑپے لگائے اور انہوں نے یاد رکھیں کہ چھپتے تو میں بھی دل کے چھڑپوں میں الجھا ہوں موجود تھا۔ لیکن وہ لوگ یاد رکھیں حلقہ الہیاب فوق اور انہاں تھا۔ ریف ہائی نے نیویارک شہر کی صورت بھلا کر رکھ دی تھی۔ مگر انہوں کی شام جینسن ہائٹس میں ہونے والے ملنے کے اجلاسوں کا کچھ نہیں بھلا سکتی تھی۔ چنانچہ شام کے وقت جو ہر میر کا فون آیا کہ آج سید ضمیر جعفری آرہے ہیں۔ تم جلدی آجیانا اور میں اجلاس سے نکل ہی جو ہر میر کے ہاں پہنچا گیا۔ سید ضمیر جعفری ملنے کے اجلاسوں کو میر خانہ اور جو ہر میر کے گھر کو گھر و میر کہتے تھے اور جو ہر میر کہتے کہ جب ضمیر جعفری آتے ہیں تو قریب خانہ ہی خانہ بن جاتا ہے۔ اس اجلاس کی مجھے صدمہ ملتا کہ پڑی اور روایت یہی ہے کہ جب ہر آئے تو مرید بھی پر تو قیام ہو جاتے ہیں اور اچھا ہوا صدمہ ملتی اختیارات کو دے گا اور میں نے ان کی ہی نہیں ان لوگوں کی بھی جو سید ضمیر جعفری کو مجلس مزاج شاعر سمجھتے تھے۔ اس ضمیر جعفری سے ملاقات کروائی اور جب دوسری شام جو ہر میر کے چرخ خانے میں اکٹھے ہوئے تو سید ضمیر جعفری نے اپنے چہرے پر کھلی بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا چنانچہ زادے تم اپنے دل کے چرخہ تم میر سے کرائے آتے ہو یا مجھے سید حاکم نے۔ جو آپ میں ایک تقدیر پڑا اور پھر یہ شام میری زندگی کا سرمایہ بن گئی۔ تمام تعلیمات، تمام اختیارات کے باوجود اس شام میں، تمام تعلیمات و اختیارات کی دیوار کو گھٹی جو شاید یہ شام نہ آتی تو میر سے اور ان کے درمیان آج بھی قائم ہوتی۔ اور ان کے بعد میں کہاں سے ضمیر جعفری کو آگیا اور ان کو ان کے اصل شخص کے ساتھ مل پاتا۔ میری فٹ سے ہر سہارے کی عقیدت پر اس ایک شام کی ملاقات پر نکالا سے بھاری تھی کہ اس شام انہوں نے شاعری بھی سنائی اور باتیں بھی۔ ہم نے ان کے گلگلی بھلا کو بھی دیکھا اور مجلسی سبھا کو بھی۔ اس شام انہیں دو ستون کے نجوم میں گمراہ بھی پایا اور دونوں ذات اکیلا بھی۔ حیرت تھی کہ وہ ہم سب کے درمیان اس قدر آگے کیوں ہیں۔ یہ جب تھا کہ جب وہ باتیں کرتے تو ہم ان کا مخاطب ہوتے اور سب شعر سناتے تو بول لگتا جیسے انہوں نے ہم سب کو منہ کر دیا ہے اور تمام راستہ مکمل پر اترتے ہیں۔ اور پتہ نہیں یہ مکالمہ و مذاکرات سے کرتے تھے یا ہمراہی سے یا اس ماضی سے جو ان کے حال میں بدستور گزارا تھا۔ ان کا مخاطب وہ ضمیر جعفری تھا جو نجوم ماہر تھاں میں محجب آرد کی سلیب پر تھا کھڑا تھا اب پتہ نہیں کہ میری محسوسات خود میرا Illusion تھا یا وہ محسوس کہ جہاں ذات کی پستی پائی عیاں ہو کر رہا ہو رہی تھی۔ تاہم یہ شام میر سے ناچنے اور آگ میں ضمیر جعفری کو رہنے پائے دونوں کی کھنڈیاں چلتے ہوئے گریہ سے چنے اور دہکاؤں پر منت سماں میں دیکھتی رہتی تھیں۔

جو ہر میر اور اشراف عیال کہتے ہیں کہ نجوم ماہر ہیں مگر وہ تو اپنی سبب اندگی کی آخری سرحد پر پہنچا تو باقی اکیلا کھڑا مقصد وہ اپنی شریک حیات کی آخری جہاں کیلئے نکلا گیا اور جب اس کے اپنے دل کی جہاں کی بڑی آتی تو وہ اکیلا تر ہو گیا تھا۔ اتنا اکیلا جیسے انہوں کے سامنے اختیار والے کے بعد۔ پھر اکیلا رہ جاتا ہے۔ اور جگہ میں لگے ہوئے سارے دلم پھر سے رہتے ہو کر وہاں جاتے ہیں۔ اس کی تو لاٹک ہو جاتی ہے۔ اصحاب ہاں کی چاہائی کی طرح دیکھتے ہوئے آنکھیں تھک سی جاتی ہیں۔ آنکھیں تھک جاتی تو تو کی پورا کاپی ہر اٹھ

ہجرتوں کے مومنیوں، خواہوں کے غزالوں اور
سفر و مسافتوں کے نقشہ گام اور سیراب جزیروں کی کہانی

معتوب

ڈاکٹر اعجاز الہی
کاناولٹ

شائع کردہ:

دی پرنٹ پبلی کیشنز اے اے پلازہ
بلیو ایریا، اسلام آباد، پاکستان

جاتا ہے۔ اور سید ضمیر جعفری اپنے آخری لمحوں میں اپنے چہرے پر لہری مسکراہٹ بچاؤ تو
نہیں ہوئے۔ مگر ان کی آواز انہیں ہمیں کی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے خود اپنی
ذہانت پر کمال لگا دیا ہو کہ زندگی بھر خوشیاں یا غم والا ضمیر جعفری زندگی کی آخری
حد کی آخری سرحد پر کھڑا ہو چکا کہ دے دو تو یہ رہا تھا تو بیٹا رہا تھا، جو بیٹا گیا تھا یہ
بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جو عمر بھر اسے ملے نہ سکا تھا، زندگی کے آخری لمحوں میں اس کا
بھسپنہ سن گیا ہو اور ایسا ہو تا ہے جب انسان برسوں بعد خود سے ملے، تو پھر خود سے بھی ہم
نکاح ہو جاتا ہے اور سب سے بے گناہ انسان ہی مخاطب ہو رہا ہے ہی عقلی آجاتی ہے۔ کون
جائے انسان کے سوچا ہو کہ زندگی بھر رشتے نبھاتے نبھاتے جو چند آخری سانس پتے ہیں،
انہیں اپنی نظر کر کے کی جائے وقت میں کیا لیا جائے۔ کہ وہ شاید یہ بھی جانتے تھے کہ
لوگ آئے، انوں کی نسبت جائے والوں سے جلدی ہو رہا ہے جاتے ہیں خواہ وہ گروہ کے لوگ
تو ان کے رشتوں سے ہی کیوں نہ ہوں۔ ہوں پھر آخری لوگ بھی سوچنے لگتا ہے۔

کون کب تک ان محفروں ہوتے ہزاروں میں رہے
کون رشتوں کو نبھاتے سرگرمی کی طرح

پھر وہ چپ چاپ آنکھیں موند کر لیتا ہے اور سید ضمیر جعفری نے یہی چاہا تھا کہ کب تک
رشتوں کو نبھاتے ہو کر انقدر تو تھے کہ ان بار بھی تھے۔ جو آسودہ کاروں تھے، موبان دونوں
رہے تھے۔ موندنا ایک لگاؤ تھا ان سے ان کے نظریات تھے۔ رخصت ہو گئے۔ اور میں جن سے ان
کا کوئی نظر پاتی رہت تھیں، ان سے، ان میں ان کے ہوں کی خاموشی اور وہی کی، حزن لگنوں کو
اب تک محسوس کرتا ہوں کہ یہ دل جو ہے وہی وہی ہے۔ مگر وہ شخص ہے کہ نہیں مانگا
میرا ضمیر جعفری کے ساتھ محبت کا اور اعجاز الہی تھا تو شاید آخری سانس تک رہے۔

”حق معترف ہے کہ وہ سب تو مر رہا تھا“



سید ضمیر جعفری عوارک میں انجیل کے پڑھ رہے

ضمیر جعفری "مانی الضمیر" کے آئینے میں

علی منور ندیم

جبکہ ضمیر جعفری جنہیں مرحوم کہتے ہوئے آج بھی قابل ہوتا ہے، محض مزاح نگاری میں ایک مستحکم مقام رکھتے ہیں۔ انہیں یہ مقام کسی اچانک حادثے یا مینڈا ہندویشن کی وجہ پر نہیں ملا اس کے پیچھے ان کی اعلیٰ حد و حد اور طرز و مزاج نگاری سے مستقل وابستگی کی طویل داستان ہے۔ جعفری صاحب کے طرز یہ مزاحیہ کلام کی پہلی کتاب کا نام "مانی الضمیر" ہے یہ کتاب سن 70ء کے لوائٹ میں مارکیٹ میں آئی تھی، جعفری صاحب اس کتاب کی اشاعت سے قبل بحیثیت مزاح نگار اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ سن چھاس اور ساٹھ کی دہائیوں کے دوران مشاعروں میں جعفری صاحب نے شجیعہ و شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ کام پیش کر دیا تھا لیکن ان دونوں مشروں کے دوران طرز و مزاج نگاری منظر پہچان تسلیم نہیں ہوئی تھی، ایوب خان کے زمانے میں ریڈیو کے ایک مشاعرے میں جعفری صاحب نے اپنی مزاحیہ غزل جس کی ردیف "پیارا کرو" ہے پیش کی تھی، اس غزل کے یہ دو شعر اسی زمانے میں بہت مشہور ہو چکے تھے۔

شوق سے قصہ جگر، نور نظر پیدا کرو
ظالمو تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
میں مانتا ہوں ذوال اہل یورپ کا چان
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

پہلا شعر پاکستان میں آبادی کی لامتناہی رفتار اور گندم کی قلت کے سبب امریکہ سے مرن گندم کی درآمد کے لیے مقرر میں خوب مزاحیہ تھا، دوسرا شعر مسلمانوں کے ذوال اور پسماندگی کے حوالے سے آج بھی مزاحیہ ہے۔ جعفری صاحب کی کتاب "مانی الضمیر" مارکیٹ میں آنے کے بعد طرز و مزاج نگاری میں ان کے مستقل مقام کا تعین ہوا، ان کے بعد جعفری صاحب نے طرز و مزاج میں جو کام کیا ہے اسے بیان کرنے کیلئے کہا جاسکتا ہے کہ "سچہ چاہیے اس پر ہے کہ ان کیلئے"۔ یہاں گھنگو کو جعفری صاحب کی پہلی کتاب "مانی الضمیر" تک محدود رکھا جا رہا ہے۔ ضمیر جعفری صاحب اپنی کتاب "مانی الضمیر" کے پیش لفظ میں اس کتاب کی طبعیت کے وقت تک اپنی مزاحیہ شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "بہب بھی میں ثابت کر اپنی کاوش پر نظر ڈالو تو شعر کے علاوہ میں خود بھی اپنی نظر سے کرنے کا، یوں محسوس ہوتا کہ جو بات کہنا چاہتا تھا کہ نہیں سکا، بات جس طرح کہنا چاہتا تھا اس طرح نہیں کہ سکا، فکر کے راستے پر ایوان معنی کے اندر داخل ہوتا تھا، دیوڑھی کے دھاتوں سے ٹپک سلیک کی ٹوبہ بھی مشکل سے آتی تھی اور فی تو کین و سندیب کے اعتبار سے محض تخلیقات کا گویا۔" گوا بھی کھل رہا تھا، پیچھا بھی کھل رہا تھا۔"

ضمیر جعفری صاحب کا اپنی تخلیقات اور نگارشات کے بارے میں ایسا تردد کرنا کوئی احساس کمتری یا غلط فہمی کا اظہار نہیں، بلکہ اس سے "اللہ اعلم" اور اسی سر قلمی اور اپنی ذاتی احساس کا احساس رکھنا ہے۔ یہ ایک بات ہے کہ فی زمانہ ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں کہ وہ چار انٹی سیدھی نگارشات اور چند غیر معیاری ادبی ذوق رکھنے والوں کی دائرہ متاثرین بن کر اپنے آپ کو ضمیر، ملین، غالب اور نیر کے ہم پل سمجھنے لگتے ہیں۔

بھول جعفری صاحب وہ "اپنے کام کو اور کشاکش میں ڈالنے کا سوچ لیا رہے تھے کہ ان کے دو قریبی دوست کرشن محمد خان اور میجر صدیق سالک ایک روز ان کے گھر آئے اور مزاحیہ شاعری کا سارا پلندہ اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد میجر صدیق سالک نے منظومات کو مسودے کی صورت میں ڈھالنے کا اور کرشن محمد خان نے انتخاب کلام اور اشعار کی معنوی ترتیب دینے کا فریضہ انجام دیا۔ کرشن محمد خان نے اشعار کو ریڈیو پر گونگ کر لیا تھا، جن اشعار کی سلاخی لیتے رہے مسودے پر منسوب کی دیکھ بھال کرتے رہے۔" ضمیر جعفری صاحب اپنے دو مشنوں کے تعاون پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب مصنف کی زندگی میں لکھی گئی اس طرح شائع ہو رہی ہے جیسے مصنف کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔" جعفری صاحب اپنی کتاب کی اشاعت کو گاؤں میں شادی سیال کی تقریب سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "احباب کی لگن لگاؤ اور چار کو دیکھ کر میر سے ذہن میں بے اختیار اپنے گاؤں میں شادی سیال کی بعض تقریبات کا نقشہ تازہ ہو جاتا تھا جن میں گھر والوں نے صرف شادی کی تیاری ہی کا اعلان کیا تھا، باقی سارے انتظامات برادری کے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ کوئی چار پانچ جمع کر رہا ہے، کوئی لستر، کوئی گھون۔"

ضمیر جعفری صاحب پر گھنگو کرتے ہوئے اور طرز یہ مزاحیہ ادب میں ان کے مقام کا تعین کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے دو اہم سوالات کا جواب ضرور حاصل کر لینا چاہیے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے ادبی طرز و مزاج کیا ہے؟ فی زمانہ ادب کے حوالے سے مزاح کچھ اس طرح سمجھا گیا ہے کہ "ہر عالمی نے حسن پرستی شعری کی ادبی ہے۔ اپنے آپ کو ادیب، تخلیقی کار اور مزاح نگار کہلانے کے غلبہ میں مبتلا ہے۔ کب کوئی تحریر ادب ہوتی ہے اور کب ادب کی بدولت "جنگ ٹک" سمجھنے سے قاصر رہتی ہے، اس کا سمجھنا ضروری ہے۔ وہ تحریریں جو ادیب میں شمار ہوتی ہیں، غیر ادبی تحریریں سے اپنی حیثیت اور معنویت میں اعلیٰ رہتی ہیں۔ ان دونوں میں ایسی جہازیں فرق ہے۔ اہل قلم سے ادب اسے سمجھا جاتا ہے جس میں حسن لطیف کی تکنیکیں ایک مخصوص زبان اور طریق بیان کے ذریعے وہ تخلیق ہوتی ہیں اور تحریروں کی پہچان یہ ہے کہ اس میں حسرت اور غصہ صحرانہ زبان کے علاوہ کسی کو اپنی تحریر کی گرفت میں لینے کی اثر پذیرئی، ادبی سواد، اخلاقی اور سماجی

شعور، ذات سے کائنات تک کے وہ معاملات جن کا تعلق انسانی جذبات یا ذہنی و فکری واردات سے ہو موجود ہوتے ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو ادب کو غیر ادب سے علیحدہ کرتی ہیں۔ تحریروں کی وسعت اور مخصوص طرز بیان میں ظاہر ہو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ ہمارے حس لطیف کی تسکین کو کرتے ہیں لیکن وسعت اور طرز بیان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان الفاظ کے پیچھے کچھ عقلی مفہوم اور معانی بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ادب جذبہ، فکر، سوچ، خیال آفرینی کے ساتھ ساتھ ہمارے حیات کی تخلیق و تشریح بھی کرتا ہے۔ ہمارے حیات و حیات ہوتی ہیں جن کا اور اک ہم صرف اپنے تخیل یا تصور کے واسطے سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ حیات عالم موجودات میں کیس بھی موجود نہیں ہوتی ہیں لیکن ہم لونی تحریروں کے ذریعے انہیں محسوس کرتے ہیں۔ ہر بڑی چھوٹی ادبی تحریر کی یہی خصوصیت ہوتی ہے اور ادبی تخلیقات کا یہی وہ حیاتی جوہر ہے جو اسے غیر لونی تحریروں سے ممتاز کرتا ہے۔ بات کو مختصر کرنے میں میر تقی میر کا شعر :-

دیکھ تو دل کہ جاں سے اچھا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اچھا ہے

جوش کیا جاسکتا ہے۔ عالم موجودات میں دل اور جاں سے دھواں اچھا خلاف واقعہ امر ہے لیکن شاعر کی ہمارے حیات نے اپنے تخیل کے ذریعے اس کو محسوس کیا ہے۔ غالب کے کام میں ہمارے حیات کی کثرت ہے اسی وجہ سے غالب، غالب ہے۔ ان کے دل ان کا پیلا شعر ہی یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ :-

نقش فریادی ہے نس کی شوخی تحریر کا
کائناتی ہے بچہ بن ہر دھم تصویر کا

نقش کو فریادی کی صورت میں دیکھنا کائنات کی تخلیق کو شوخی، تحریر کی طرح بڑھتا اور ہر تصویر کو بیکریت کی ایسی حالت میں دیکھنا کہ وہ کائناتی چیز بن چکے ہوئے ہے، اچھی تخیل آفرینی غالب ہی کر سکتا ہے۔ مگر غالب نے اپنی حیات کو اپنے شعر میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ ہماری عالم تخیل میں غالب کی انہی جڑے پکڑے عالم حیات کی میر گرتا نظر آتا ہے۔ نقش کہتے ہیں :-

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

باد نو بہار کا یہ الفاظ کرنا کہ شاعر کا محبوب گلشن میں آجائے تو وہ فطرت کے حسن کو سنوارنے کا کام شروع کرے۔ گلوں میں رنگ بھرے جائیں، کوئٹہ پھوٹیں، ہجرہ اندازے ہمارے بہار چلے، عقل اور عقلی طور پر غیر منطقی ہے مگر شاعر نے اپنے تخیل کی مدد سے نئی حیات کی تخلیق کی اور اس طرح شاعر کا عالم تصور حقیقی دنیا سے مختلف لیکن ایک مخصوص وجود کھنکھال ہو گیا۔

یہ شعرا ہمارے حیات کی تخلیق کرتے ہیں اس لیے شاعری میں تشبیہ اور استعارے سے - کائنات میں کہ دار اور مظہر نگاری سے اور طرز و مزاج نگاری میں حرکات، واردات اور واقعات سے مدد لی جاتی ہے۔ ہر طرح کی ادبی تحریر قاری کی ہمارے حیات کو تحریک دیتی

ہے۔ اس عمل میں ادب کی ہمارے حیات اور قاری کی ہمارے حیات ایک مقام پر جا کر ابلاغ اور ترسیل ابلاغ میں یکساں ہو جاتی ہیں، یہی وہ عمل ہے جسے ہم "معیاری ادبی تخلیق" کہہ سکتے ہیں۔

ادبی طرز و مزاج نگاری کو سمجھنے کیلئے ہمیں سب سے پہلے تو ذرا گہرا غور و فکر کی ضرورت ہے۔ قول ذہن میں رکھنا ہو گا کہ طرز و مزاج نگاری محض ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں ہے۔ ہنسانے کا کام تو کسی ایجنٹ یا سرکس کا کامیڈین یا جوکر بھی کرتا ہے لیکن ہم اسے ادبی طرز و مزاج کا نام دیتے نہیں دے سکتے۔ ادبی طرز و مزاج کو پہلے تو لوہے یا ہنسنے کے ہونے ادب کے وسیع مفہوم اور اس کی واضح تعریف پر غور کرنا چاہیے اور دوسری اہم بات یہ کہ ادبی طرز و مزاج کے اندر نیکی کا جذبہ بھی کارفرما ہونا چاہیے۔ نیکی کا وہ جذبہ جس سے کسی غامض اور الٹی یا ظالمی کی اصلاح یا نشانہ دہی ہو سکتی ہو اسی کے کہا جاسکتا ہے ادبی طرز و مزاج گہرے شاعر کی طرح ہوتا ہے کہ جتنا الفاظ کے پردوں سے باہر نظر آتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ مفہوم الفاظ کے پیچھے ڈھپا ہوا ہوتا ہے۔ ادبی طرز و مزاج کے اندر مگر انوکھ اور دوہرا چھپا ہوا ہوتا ہے۔ خود ضمیر جعفری صاحب نے اپنی مزاج نگاری کے بارے میں کہا ہے کہ :-

میرے شعر تو پر جس لینے کے بعد
ویدہ الہی نظر تر ہو گیا

یہ خصوصیت جناب ضمیر جعفری کے علاوہ دنیا کے جتنے بھی بڑے بڑے طرز و مزاج نگار ادیب ہیں ان سب کے ہاں موجود ہے۔ ان تحریروں کے ظاہری معنی و مطالب کے پیچھے بہت بڑے بڑے مسائل کی نشان دہی اور زندگی کے بہت بڑے بڑے سوالات ملتے ہیں۔ جب ہی وہ ادبی طرز و مزاج نگاری کے گہرے معیار پر غور کرتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں انہیں ادب سے خارج کرنا ہو گا۔

ضمیر جعفری صاحب کی کتاب "مافی الضمیر" ادبی طرز و مزاج نگاری کے معیار پر غور کرتی ہے ظاہر پہلی نظر میں اس میں چند ہنسنے ہنسانے والی باتیں ہیں مگر جب آپ گریہ کرتے کرتے الفاظ کے پیچھے جھانک کر دیکھتے ہیں تو آپ کو زندگی کے، حیات کے، معاشرے کے، عہد حاضر کے، مشرقی و مغربی تمدن کے اور مجموعی طور پر انسانی فطرت کے بڑے بڑے مسائل اور مسائل نظر آتے ہیں جن کا احساس کرتے ہوئے آپ کی آنکھیں نم بھی ہو سکتی ہیں۔

مافی الضمیر کے چند اشعار کے اعادے اور ان کے پیچھے چھپے ہوئے معانی و مطالب کی نشان دہی ہو جائے تو بات سمجھنے میں آسانی ہو گی، جعفری صاحب کا ایک شعر سنئے، یہ شعر انہوں نے انگلشٹن کے حوالے سے اپنی نظم "میراج الہی منشور" میں لکھا ہے :-

بھر پر کھول کر ہمارے "مسائل خرد مندی"
مناسب حد میں رہیں گے "زن آزادی و نر مندی"

ہمارے کسی سیاسی لیڈر کا قوم کے "مسائل خرد مندی" کو سمجھنے کا دعویٰ اپنی جگہ بات خود کتاب مصحکہ خیر ہے اللہ اللہ کیا جاسکتا ہے ہمارے اس کے ساتھ ہی زن آزادی اور نر مندی کو مناسب حد میں رکھنے کا منشور ہمارے سیاسی فطرت کے پیچھے اصل خفا کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک اور شعر ہے :-

آری سے سلوک دنیا کا
جیسے انداز سے کرے کوئی

مکتوبوں نے لکھے آہنگیوں پر طالعے دے اور کچھ آہنگیوں میں راکھ لکھ رہی ہے۔ ان
کارہاموں کو یاد کر کے اس صورتحال پر غصے وارہ نہیں، آپ پر غصہ ہے۔ جعفری صاحب
کی ایک اور نظم کے دو شعر دیکھیں۔

کبھی اک سال میں ہم غلّیں اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں

ہم نے علامہ اقبال کا جو شعر کیا وہ اس شعر سے واضح ہے۔ سرکاری سطح پر سال میں
ایک بار اقبال کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں پھر سارا سال قوال علامہ اقبال کی سال
علائے رہتے ہیں۔ ان قوالوں میں نہ ہی باڑی کروں، نہ سپاہی شہیدوں، باڑاں کے علاوہ اور کون
کون شامل ہے یہ الگ الگ ہے۔ اسی نظم کا ایک اور شعر ہے۔

ہم کی سچ راندی کو کچھ روکا تو ہے ہم نے
بہیں جو آج کرتا ہے وہ اگلے سال کرتے ہیں

ہم مسلمانوں اور خاص کر پاکستانیوں کے ایک مخصوص، قہر کی طرف اشارہ ہے۔ اس
الجے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ یہ شعر دیکھیں۔

نظر کی میب ہوئی، دل کی ہولناکیاں
یہ دو صدیوں کی عادت ہے یہ آسانی نہیں جاتی

ہندوستان دو سو سال غلام رہا۔ اس غلامی نے ہماری کیا ذہنیت متا دی ہے اس کا ذکر ہے۔
جعفری صاحب کی ایک اور نظم شری سڑکوں کے بارے میں ہے۔ سڑک کہہ کر فدا اور ترقی
کی علامت ہوتی ہے اس میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہیں وہ کہتے ہیں۔

کڑی اونچائیوں کے پیٹ میں گمراہیاں دیکھو
گڑھوں کی جا جا ہولناکیاں، چھتائیوں دیکھو
ہم ان سے علم و مہر و ضبط کا پیغام لیتے ہیں
کہ جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں

ان اشعار میں جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں کا لطف لیں، ضمیر جعفری صاحب کی
اسی ہی باتوں سے متاثر ہو کر میں نے انہیں اپنا روحانی استاد مانا ہے۔ دنیا والوں کے ہمارے
میں علم آیا تھا کہ ہر فنکار کی لہجہ اور قرأت سے کی جاسکے۔ لوگوں نے اسی پر اس طرح عمل
کیا کہ ہر فنکاروں کے فنکاروں سے پہلے تلاوت کرائی جائے گی، اس پر میں نے کہا تھا۔

سرکاری علم اترا ہے علم وحی کے ساتھ
اب اس کے بعد قوم کا مولا بھلا کرے
قرأت سے وہ رقی ہے ہر ایک شے کی ابتداء
بسم اللہ کہہ کے باقی بھی بھرا کیا کرے

ان کا ایک عام سافل ہے لیکن اس عمل کیلئے پہلے اندے کو توڑا جاتا ہے پھر اس کو پینٹنا
جاتا ہے پھر اس کو گرم گرم تو سے یا فراتی پان پر کھولتے ہوئے تیل میں ڈال کر اٹا پانا جاتا
ہے۔ اتنے سارے عوامل کا نام اندا لکھا ہے۔ ہمارے علم میں دنیا کا آدمی سے ایسا ہی کچھ
سلوک ہے۔ اگر ہم تنقید کی سے سوچیں اور معنی کی گمراہی کا اندازہ کریں تو ہمیں اپنے علم
اور طرز پر چاک دینا پڑے گا کہ اس شعر کے اندر ایک آشوب روزگار محسوس ہو گا اور آنکھیں نم ہو
جائے گی۔ ایک اور شعر دیکھیں۔

مد و جزر زندگی کی بدولت آگیا
ہر قدم پر وہ قدم پیچھے سرک جاتا مجھے

علامہ جعفری صاحب نے اپنی کم ہمتی کا ذکر کر کے اپنی شخصیت کا خاکہ اڑایا ہے اور بلورانی
حیثیت کو کام لاتے ہوئے تصور کی آنکھ سے ایسے انسان کی رفتار کا نقشہ کھینچا جو ایک قدم
آگے بڑھتا ہے تو وہ قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لیکن جعفری صاحب نے مد و جزر زندگی کیوں
کہا یہ تو کسی سمندر کا ذکر کر رہے ہیں اب ہمیں سمندر کی خاصیت کے بارے میں سوچنا پڑتا
ہے۔ سمندر سے جب زمین حاصل کی جاتی ہے تو اس کے آگے پیچھے ہٹتا رہتا ہے، سمندر
میں چلتوں کو ہمالے جانے کی قوت رکھنے کے باوجود اپنی وسیع نظری کا ثبوت اس طرح دیتا
ہے کہ زمین بھڑک کر خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اب ہمیں شاعر کم ہمت نظر نہیں آتا، شاعر تو
اپنی وسیع نظری کا ذکر کر رہا ہے اور شاعر کی زندگی میں مد و جزر پیدا کرنے والے لوگ بہت
جھوٹے لوگ لگتے لگتے ہیں، ان کی حالت پر افسوس اور ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اب
مزاں کا ایک شعر دیکھیں۔

یہ تیرے حق کی ٹوپی تیرے سر پر تھی بھی
یہ نہیں ہے وہ تو پھر وہ ہے کہاں مجھ سے نہ پوچھو

حق کی آگ جانے کیلئے اس کے اوپر عثمانی ٹوپی رکھ دی جاتی ہے شاعر اپنے مخالف کے سر پر
ٹوپی نہ دیکھ کر کہتا ہے کہ مجھے لگتا ہے حق کے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی وہی ٹوپی ہے جو کبھی
تیرے سر پر ہو کر تھی تھی اور اگر یہ ٹوپی وہ ٹوپی نہیں ہے تو تیری ٹوپی کہاں گئی، مجھ سے نہ
پوچھو۔ یہاں مجھ سے نہ پوچھو میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہے تیری ٹوپی کہاں ہے لیکن
مجھ سے نہ پوچھو تو بھڑکے۔ ٹوپی، پگڑی اور طرہ دہاری تہذیب اور شرافت کی علامت اور
عنائی ہوا کرتے تھے۔ ہم نے اپنی تہذیب اور شرافت کو کسی طرح جاہ کیا ہے اس شعر میں
اس الجے کی نشاندہی ہے اور یقیناً یہ کوئی حسد و لہجہ بات نہیں ہے ایک اور شعر دیکھیں۔

آہنگیوں پر طالعے، آہنگیوں میں راکھ دیکھو
کارہام شری کو بالعموم مجھ سے نہ پوچھو

اس شعر کے عمل معنوں اور الجے کا ذکر کرنے سے پہلے کہ وہ شاعر تو بالعموم کی عمل
دیکھیں۔ یہ ہے یہ کہا جائے کہ گڑھے دوسروں کے اندر بے نظیر اور لواذ شریف

ضمیر جعفری صاحب کا ایک اور شعر دیکھیں۔ اس شعر میں شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کے لا جواب سے ہوئے شخص کی حالت پر گہرا مطلب ہے۔

مر مر صبرا نور دی کی مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا کیسا مجھ دار آوی

جعفری صاحب کا ایک اور مزید شعر دیکھیں۔

زاہد کو سے پاؤں کے پھیلنا ہے حشر
نقد و گناہ دونوں کا اسی حساب میں

یعنی شاعر نے تو دوستی میں زاہد کو اپنی جیب سے شراب پائی اب زاہد کہہ رہا ہے کہ شاعر نے گناہ کر دیا یعنی نقد تو خرچ ہو اسی تھا، شراب پینے کا گناہ بھی شاعر کے حساب میں کھانا گیا۔ اب یہ شعر دیکھیں۔

میاں رمضان گروہن تک تو کچھ کچھ ٹھیک آتے ہیں
مگر پھر بعد کی گزیر میں سر پیدا نہیں ہوتا

اگر میاں رمضان کا مطلب آج کے دور کا مسلمان لیا جائے تو آپ کو اپنے اطراف ایسے دو چار ضرور نظر آئیں گے جن کے ہاں بعد کی گزیر میں سر پیدا ہی نہیں ہوا۔ اب "مافی الضمیر" سے کچھ اشعار بطور کسی تجربے کے پیش ہیں، پڑھیں اور لطف لیں۔

آج کل ممبر رسول پر بھی
لوگ لکھ لکھ لکھ رہے ہیں

یوں ہمہ الحاق سے بچتے رہے ضمیر
لپٹے رہے کبھی تو کبھی دیکھتے رہے

اتارو طاق سے ان میں بھی جھانکنا ان میں بھی دیکھو
مبارا شہد چھٹا ہوا پرانے مریجانوں میں

تیزیوں کو کاش اہل مدر
علم سے پہلے کوئی شکار دیں

کوئی رونی، کوئی رازی، کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی نواہی ان کے جہازوں میں ہوتی ہے

وہ تراشی زلف و سرو ہو کہ محراب قبا
ہے زمانے میں اسی عالم جو مردانے میں ہے

بناب شیخ یوں چلتے ہیں علم و فضل کو لے کر
کسی طبلے سے جیسے کوئی الماری نہیں جاتی؟

شیخ جی کے حق میں یہ مانگو دعا اسے دوستو
ان کو روٹی بھی خدا جیسے، دل روشن کے ساتھ

کھانا نہیں یہ بھیہ کہ بزم سخن میں لوگ
طبلے کے ساتھ ہیں کہ سخاوت کے ساتھ ہیں

ہائے کس کمسن پہ کس موسم میں دل کیا حشر
اس کو فیشن چاہیے، فدوی کو فیشن چاہیے

جی ہے شرق اور مغرب ایک ہو سکتے نہیں
اس طرف بیوی کھلی ہے، اس طرف شوہر کھلا

میں رہی ہے مشین مغرب میں
اور شرق میں چلی چلا ہے

مغربی میں جس کی ذرا محی ہو گئی
زیست خراب و منبر ہو گیا

دریاد و انہوں، شہت مریجانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں

بھائی مولا جھٹ کس کس فلسفے کو دوت دے
بھائی مولا جھٹ کو اپنا بھی نام آتا نہیں

یہ فیض کثرت اولا وہ نوبت بھی آ پہنچی
کہ اب سنے کی ماں، شوہر کی ماں معلوم ہوتی ہے

وہ کہتے ہیں کہ دنیا امن و آسائش کی جنت ہے
چلو ہم آج ان کو آج کا اخبار دیتے ہیں

ضمیر جعفری صاحب کی کتاب "مافی الضمیر" سے یہ پیچیدہ پیچیدہ اشعار لئے گئے ہیں، ادبی کی سطور میں ماورائی حیرت کو ادبی تخلیق کا پیاری جوہر کنا گیا ہے۔ اگر جعفری صاحب کے اشعار جاری کی نظر اور احساسیات کو کچھ سوچتے کچھ سمجھنے کی تحریک دیتے ہیں تو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی نگارشات نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اکبر الہ آبادی کے مہتر اشعار میں بھی یہی کیفیت ہے انہیں بھی پڑھ کر خطا یاد قلم نہیں اٹھتا لیکن سوچنے اور سمجھنے کیلئے بہت دیر تک قاری کا ذہن ان اشعار کی گرفت میں رہتا ہے۔ درج بالا اشعار پڑھ کر جناب ضمیر جعفری کی نگارشات کے معیار اور اشعار میں تخلیقی معنوی گوشوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان

بیادِ سید ضمیر جعفری

جلیل یوسف

پچھلے دنوں جب سے میرا مشہور ضمیر جعفری کے انتقال پر غماں کی خبر آئی ہے ان کی یادوں کا ایک مجموعہ ہے جو ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ یادیں کمبوش گزشتہ 42 سالوں پر محیط ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات 1957ء میں ہوئی تھی جب میں گورنمنٹ کالج پٹنوال میں سال دوم کا طالب علم تھا، وہ کالج کے مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ یوم ادب کا سیکرٹری ہونے کے باعث شاعروں کے استقبال کا خوشگوار فریضہ میرے سپرد تھا، یہ ان کا پہلا اعزاز تھا کہ پوسٹ شرم میں کوئی شخص اپنے سے زیادہ خوش قسمت نظر نہیں آ رہا تھا۔ جعفری صاحب اس طرح محبت اور شفقت سے پیش آتے جیسے کوئی اپنے غلوں سے ملتا ہے۔ ان دنوں شعر و سخن میں میرے اضاک کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے میں سنی ہوئی اکثر نظمیں اور غزلیں مجھے نہائی یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ جعفری صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں وہ نظمیں سنائیں۔ ”پرانی سوز سوز“ ضمیر کا گھر۔ ”وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جعفری صاحب گول منول سے ایک معصوم بچے کی طرح بڑی سنجیدگی سے اپنے شعر ترنم سے مناد ہے تھے۔ سامعین تھے کہ انہی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں تو اسی وقت سید ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری پر ایمان لے آیا تھا اس طرح کے شعر نہ کہیں پہلے پڑھے تھے نہ سنے تھے۔ ان کی دونوں نظمیں یاد ہو گئیں۔ میں کئی دنوں تک غلام گرد شوں میں ان نظمیں کے اشعار گنگنا رہا اور ہر کسی کو سنا رہا۔

پھر کر بھیجی جاتی ہے جگر کر لائی جاتی ہے
”وہ کہتے ہیں کہ پھر بھی اس میں سوز پائی جاتی ہے“

لکڑی کے نصف ہٹ میں میرا ہے آج کل
قدوی بھر نہیں ہے میرا ہے آج کل

”قدوی بھر نہیں ہے میرا ہے آج کل“ اس طرح کا مصرع بھی اور شاعر نے آج تک نہیں کہلائے کہ کہتا ہے اس لئے کہ مزاحیہ شاعر اکثر دوسروں کی فنی اڑاتے ہیں۔ جعفری صاحب کا اسلوب خاص یہ ہے کہ وہ دوسروں پر ہنسنے کی بجائے خود اپنے آپ پر ہنستے ہیں۔ انہوں نے خرائٹ میں دوسروں پر نہیں خود پر ہنسنے کی طرح ادا کی ہے۔ ہمیں اپنے حال پر ہنسا سکھایا ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنے والے کی روش اختیار کی ہے۔ خود امتحانی کی راہ آزمائی ہے۔ یہ ان کی عطا ہے دوسروں پر تو سب ہنستے ہیں اپنے آپ پر ہنسا اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے کر اپنے حال پر ہنسا ہی واصل خالص مزاح ہے جس پر طعنے کا شائبہ تک نہیں ہو تا اور اگر جعفری صاحب کسی دوسرے شخص کو اپنے مزاح کا موضوع بناتے بھی ہیں تو ان کا انداز ہلکا

اس طرح کا ہوتا ہے کہ جو شخص ان کے مزاح کا نشانہ بنتا ہے وہ ہائی لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے مگر میرے ذہان میں ایسے اشعار بہت ہی کم ہیں جن میں انہوں نے اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص کی کسی کیفیت یا صفت کدائی سے مزاح پیدا کیا ہو۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جس کیفیت سے وہ مزاح لے کر نکالتے ہیں پہلے اسے اپنے آپ پر جاری کرتے ہیں پھر اس کیفیت میں از سر تا پھر اور اپنے آپ کو ایک سامنے لا کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ دوسروں کی دل آزاری کے وہ کبھی سر تکب نہیں ہوتے نہ تحریر سے نہ تقریر سے۔ نہ کسی بھرے جلسے میں نہ کسی فنی محفل میں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی کی دل آزاری کرنے کے لالہ ہی نہ ہوں۔ کسی کے خلاف بات کرنا، کسی پر تنقید کرنا، حتیٰ کہ برائی کو برائی کہنا کسی کی غلطی یا زیادتی کی نشاندہی کرنا کسی پر کھٹ پھٹ کر ان کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ وہ کوئی ایسی بات کبھی نہیں کرتے تھے جس سے کسی کا دل دھکنے کا اندیشہ ہو۔ غالب یا ماضی میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی بات کسی کے خلاف نہیں سنی۔ میں نے کئی دفعہ کئی لوگوں کی کینگی اور ہنسی کا ذکر کر کے ان کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ انہیں بتایا کہ فلاں شخص آپ کے خلاف یہ کارروائی کر رہا ہے مگر وہ کبھی کسی کے خلاف بات کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہاں تو اس بات کو اس کی اچھائی بیان کرنے لگے۔ ایسے موقعوں پر ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ ”نہیں آجیل آپ نے خود نہیں کیا اس کے رویے کی وجہ وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں۔ ان سے ذرا صل کیا اور وجہ سے ایسا کیا ہو گا۔ اس کی کوئی بھوری ہو گی۔ وہ برا آدمی نہیں۔“ ضمیر جعفری صاحب نے ایسے موقعوں پر پیش مجھے مشکل میں ڈالا۔ اگر کسی کی کج روی کا کوئی قابل تردید اور واضح ثبوت سامنے آجاتا تو جعفری صاحب اس کا کہتے ”یار اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اور پھر موضوع گفتگو بدل دیتے۔

سید ضمیر جعفری کے فرزند ارشد ریگڑ پیر احتشام ضمیر نے ایک دفعہ بتایا کہ میں جب گورڈن کالج میں پڑھ رہا تھا تو ان دنوں مجھے سکرینٹ نوشی کی لت پڑ گئی۔ گھر میں سکرینٹ کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر لیا جان کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ صاحبزادہ صاحب سکرینٹ کا شوق فرماتے لگے ہیں۔ ایک دن میں مچ سویرے کالج کیلئے نکلنے لگا تو لو نے گولڈ لیف کی ایک ڈلی جو ٹائلا وہ ایوان صدر سے لائے تھے کیونکہ اس پر پریزیڈنٹ ہاؤس لکھا تھا میری طرف بڑھا دی کہ یہ لوہے میں نے خیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”اگر سکرینٹ کی ڈبیا میں بھلاستے کیا کروں گا؟“ وہ مسکراتے ہوئے نہ کہنے لگے۔ ”اچھا تم نے اسے کچھ نہیں کرنا۔ پھر بھی لئے چلو پھر سکرینٹ کو دے دو۔“ گویا جعفری صاحب اپنے بیٹے کو بھی براہ راست یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس کی سکرینٹ نوشی سے آگاہ ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پریشان ہو جائیں۔ اپنے غلوں پر ہی کیا موقوف ہے محبت اور شفقت کا ایک روئے ہو ہر ایک کے ساتھ روا

رکھتے تھے۔ دوسرا محبت تھے کوئی ان کی محبت کا اہل ہو یا نہ ہو ان کی محبت اور شفقت سورج کی روشنی کی طرح سب کیلئے تھی۔ ان کا اسلوب حیات اس مشہور مصرعے کی مجسم اور بیتی چاکتی تصویر تھا۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جعفری صاحب کے چاہنے والوں نے بھی ان سے بڑی محبت کی۔ جہاں جاتے لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ان کے آگے بچے چلے جاتے۔ شہر و محفل سے دلچسپی رکھنے والے رہے ایک طرف، عام لوگ بھی جو محفل ان کی صورت سے آشنا تھے، بڑے شوق اور چاک سے ان کی طرف پلٹے۔ مجھے ان کے ساتھ کئی دفعہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار پر بندہ دور ان سفر بھی محفل اوقات ان کی پڑ پڑائی انہی کی بھڑائی اور محبت سے کی جاتی کہ یہ صورتحال خلاف توقع نہ ہونے کے باوجود کئی دفعہ مجھے حیران کر دیتی، کسی ناشکیبائی یا لیدر کا استقبال تو بالکل مختلف قسم کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی آمد کا تو پیٹے سے پتہ ہوتا ہے۔ اس کے شایان شان استقبال کا قصہ صاف اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ ان کو دیکھ کر چٹا کوہِ ثار و شمع کر دیتے ہیں ہم نے کئی بظاہر اور بدلیش ساتھ وفاقی وزیروں کو اپنے لیدر کی کار کے سامنے بھڑکوا دیا ہے دیکھا ہے مگر یہ لیدر ان کے اہم حسب اقتدار سے باہر ہوتے ہیں تو کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔ میں جعفری صاحب کا ذکر کرتے کرتے کہاں پہنچ گیا۔

پہ نسبت خاک را با عالم پاک

جعفری صاحب کی قربات میں دوسری ہے جس شخص یا گروہ پر وہ اترتے تھے ان کو دیکھ کر انہی لوگوں کے چہرے مکمل اٹھتے تھے۔ این پوڈٹ کے اہلکار اور پورے محفل سے اشتیاق سے ان کی طرف پلٹتے تھے اور بڑی چاہت سے ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اپنا حق عند دست ان سے وصول کرنے سے انکار ہی ہو جاتے۔ وہ جعفری صاحب سے ایسا سلوک کرتے جیسے جعفری صاحب ان کے کوئی عزیز ارشد و مرید نہ ہوں۔ یہ سب لوگ ان کی شاعری، خاص کر ان کی حجازیہ شاعری کی وجہ سے ان سے محبت کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری برس بچیس سالوں میں تو ان کی پڑ پڑائی روز افزوں تھی۔ لوگ ان کو سننے کیلئے اپنے گھروں میں خصوصی محفلیں جاتے تھے۔ ویسے بھی ہر محفل میں انہیں بڑے اسرار سے مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ جعفری صاحب قمر میں سوہو ہوں اور وہاں کوئی تقریب ان کی شمولیت کے بغیر مکمل کی جاسکے۔ تقریباً ہر روز ان کا کھانا ہوتا تھا۔ سید ضمیر جعفری اور ہمارے ایک دوسرے دوست عزیز ملک صاحب کہا کرتے تھے کہ جعفری صاحب کی قسمت میں بڑے عمدہ کھانے ہیں مگر دوسروں کے گھر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی تقریب میں چائے کا کھانا خود کرتے ہوں یا ان میں شرکت کیلئے کسی قسم کی کوئی کوشش کرتے ہوں لوگ خود ہی انہیں لے جاتے تھے۔ ملاقات تو دو ایک وقت ایک سے زیادہ تقریبات میں مدعو ہوتے۔ ان کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ کس تقریب کو ترجیح دے۔

جعفری صاحب کے اسلوب حیات کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے قلم اور کاغذ کے علاوہ اور کسی چیز سے انہیں کچھ سروکار نہ تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ لکھ رہے تھے۔ کسی اور چیز کی جانب ان کی توجہ کبھی معنوں میں کم ہی مبذول ہوتی

تھی۔ بظاہر وہ آپ کی بات سن رہے ہوتے یا زندگی کے عام مسائل کے بارے میں آپ کے ساتھ شریک گفتگو ہوتے مگر محسوس ہوتا تھا وہ ہم سے انہماک سے گفتگو میں شریک نہیں ہیں۔ محفل ہوں ہاں گھر ہے ہیں یا آپ کی ہاں میں ہاں ملتا رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کی وہ کھینچ نہیں۔ روزمرہ زندگی کے عام مسائل کو پر کی سطح پر ہی تھیر رہے ہوتے جب کہ چلی اور کمری سطح پر کسی مصرعے کی نوک چلک درست ہو رہی ہوتی۔ جس طرح سمندر کے لہر جہاز اور کشتیاں چپکے چپکے لے کھاتے ہوتے ہیں مگر گہرائی میں ایک اور ہی دنیا آباد ہوتی ہے۔ کچھ ایسی حال جعفری صاحب کے ظاہر و باطن کا اتحاد کچھ تو یہ ہے کہ فکر شعر کے علاوہ انہیں کوئی اور فکر نہ تھی۔

بعض لوگ جو سید ضمیر جعفری کی زندگی کے حالات و واقعات سے آگاہ ہیں جانتے ہیں کہ اسلام آباد کی پہلی ایسٹ رکھنے والوں میں جعفری صاحب پہ شخص نہیں شامل تھے، وہ خود فرماتے ہیں۔

شام رخصت آگئی اس شہر خوش اوقات سے
جس کی پہلی ایسٹ رکھی میں نے اپنے ہاتھ سے

سی ڈی اے اسلام آباد کا ادارہ قائم ہوا تو جعفری صاحب فوج سے سی ڈی اے میں بطور ڈائریکٹر چلک رہی لیٹھڑ آگئے۔ وہ کم و بیش پندرہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ سی ڈی اے کے چند اسیوں اور نوئی فکر کوں نے بھی اسلام آباد میں ایک چھوڑ گئی کئی جگہ مائے جبر مگر جعفری صاحب نے کم و بیش 35 سال اسلام آباد میں مقیم رہنے کے باوجود اپنے لئے کوئی مکان نہیں بنایا۔ سی ڈی اے کی طرف سے انہیں پلاٹ اہل ملا۔ اس کے علاوہ فوج کی طرف سے انہیں دو تین دفعہ رہائشی پلاٹ الاٹ کئے گئے مگر جعفری صاحب کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان پلاٹوں کا کیا مانا؟ کہاں گئے؟ ان کے بیوی بچوں نے کب اور کیسے وہ پلاٹ بیچ دیئے؟ جعفری صاحب نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں۔ ان کی ترجیحات تو مختلف تھیں۔ ان کی دنیا ہی الگ تھی جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

مکل ایسا کیا تعمیر مرنی کے تجھیل نے

جعفری صاحب بھی اپنے فکر و فن کے مکل میں رہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایسٹ سینٹ نور لوہے سے بنے ہوئے مکان کی بھلا کیا حیثیت تھی جو جعفری صاحب اور عمر توجہ اپنے یہاں بھیجے جعفری صاحب کی ایک خوب صورت تعمیر آبادی ہے اس القلم سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خواب کیا تھے؟ ان کی آرزوئیں کیا تھیں؟ انہیں کس دنیا میں رہتے تھے؟ ان کی خواہش سے مستقبل کا کون سا افق ان کے مد نظر تھا؟ یہ بڑی خوب صورت اور بڑی اچھوتی نظم ہے، اسی ہیابی سال کی عمر میں شاید ہی کسی شاعر نے اس یقین، امید، اعتماد اور چاہت کا اظہار کیا ہو۔ مجھے تو ساری اردو شاعری میں اس طرح کی نظم کی کوئی اور مثال دکھائی نہیں دیتی۔

یہ وہ گز رہے جس کے لئے
یہ رخت سفر ہے جس کے لئے
یہ تاب نگر ہے جس کے لئے
خالی میرا گھر ہے جس کے لئے

وہ شعر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریب خواب ابھی آگے ہے
میں ایک وصال مسلسل ہوں
ان ہوں غی غمیلوں سے میں

اک صد جراتی رکھتا ہوں
آئندہ نسلوں سے میں
میرا صد شباب ابھی آگے ہے
میرا شعر گلاب ابھی آگے ہے

اے میرے قلم مست رک جائے
ایک اور کتاب ابھی آگے ہے
میرا ماضی پیچھے گاتا ہے
فرما کر باب ابھی آگے ہے

میرا شعر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریب خواب ابھی آگے ہے
میرے ہم کا جام سنجال رکھو
میری شام شراب ابھی آگے ہے

یا کردہ گناہوں سے کہہ دو
میرا تم سے حساب ابھی آگے ہے
میرا شعر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریب خواب ابھی آگے ہے

ہندو شاعروں کا عمومی رویہ یہی ہے کہ وہ اکثر ماضی میں ہی آنسو بہاتے رہتے ہیں۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خان نصیر
وہ دلوں کے کہاں وہ جوانی کدھر آگئی

مسلک ہو مجھے توئی غالب
اب حاضر میں امتحان کبھی

اس کے مقابلے میں ہندو شاعر جس عزم اور امید کے ساتھ ماضی کے چائے مستحقین کے استقبال کے گیت گاتے ہیں وہ اس کا جو اب نہیں، ان کا ایک اور شعر ہے۔

رہا ہے تازہ ہر اک چہرے پر اک منظر کے ساتھ
میں بوجھ اپنے کو نہ آئے اوں کا کیلئے کے ساتھ

میں ہندو شاعر کی سنجیدہ شاعری پر غور کر جاؤں تو ان کی انفرادیت اور ان کی عظمت

دلچسپی پر حیران رہا ہوں۔ لوگوں نے صرف ان کی مزاحیہ شاعری پر توجہ دی۔
مقامیوں میں سائنس دان سے صرف مزاحیہ انشوار سنائے کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ ہندو شاعر
صاحب کے ساتھ بڑی زیادتی تھی۔ آپ تصور کیجئے اگر لوگ مرزا غالب سے اس کے طنز و
مزاح سے بھرے ہوئے خطوط ہی سننے لگتے اور اس کی غزلوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ
دیتا تو یہ کتنا افسوسناک واقعہ ہوتا۔ غالب کے دل پر کیا گزرتی۔ میں سمجھتا ہوں صاحب کے ساتھ ہوا
کہ وہ ہندو شاعر نے کہا ہے کہ۔

”اگے ہاتھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے“

ہندو شاعر کی سنجیدہ شاعری ابھی گویا ایک نیا کتاب کی صورت خالق لیاں پر دھری
رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو شاعر صاحب جس طرح اپنی مزاحیہ شاعری میں طنز و لہو خفا
ہیں اسی طرح اپنی سنجیدہ شاعری میں یکہ و قضا اور بے مثال ہیں۔ وہ ذاتی طور پر اپنی سنجیدہ
شاعری کو زیادہ رنج اور ہنر سے نکالتے تھے۔ اور میں بلا خوف تردید یہ بات دیکھنا چاہتا
ہوں کہ وہ مزاحیہ شاعری میں تعلیم تھے لیکن اپنی سنجیدہ شاعری میں تعلیم تھے۔ بات
تجربہ اور مولد سے واضح ہوگی۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم ہے ”والدہ مرجم کی یاد میں“
اس کا پھر یہ نکلنا افسانہ ہو۔

جرتی ہوں میں تری تصویر کے اچھا کا
رخ بدل والا ہے اس نے وقت کی پروا کا
رفتہ رفتہ حاضر کو گویا پلپٹا اس نے کیا
صدِ اطفال سے مجھے پھر آہن اس نے کیا
جب ترے دامن میں چلی تھی وہ جان باتوں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زبان
اور اب چہرے ہیں جس کی شوقی نگاہ کے
بے کیا موتی ہیں جس کی چشم کوہر ہار کے
کس کو روکا اب دامن میں کہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آئے سے رہے گا بے قرار
غاک مرتد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

اسی مضمون پر سید ضمیر ہندو شاعر کی نظم ”والدہ مرجم کی یاد میں“ سے چند اشعار
لاحظہ ہوں۔

گو میرے باؤں پر بھی تھی
سرج کیا گواہی کا
میں چوہری چہرہ کا
میں شاعر مشہور بھی
کائنات کوئی جذبات میں
انکار کا ہوا ہوا
آہ تیرے پاس جب
اور بچا کے کس سے
جرتی کی صرپ آئی ہوئی
میں چوہری چہرہ کا
میں شاعر مشہور بھی
کائنات کوئی جذبات میں
انکار کا ہوا ہوا
آہ تیرے پاس جب
اور بچا کے کس سے

تیری روا کی پہلوں میں تجھے مقدم پاؤں میں
جو تیند آتی تھی مجھے پہلوؤں کے سحر میں نہیں
رجیم کی چادر میں نہیں پہلوؤں کے گیتوں میں نہیں
دنیا کی ریتوں میں نہیں سر رکھ کے تیری کود میں
بے فکر سو جاتا تھا میں محسوس اپنے کی طرح
جو کھیلتا ہو مچھن میں جو دوڑتا ہو کھیت میں
جو لوتا ہو ریت پر تجھے گمروغوں میں لئے
وہ خواب جو دیکھے نہ تھے وہ چاند جو نکلے نہ تھے
احساس میں رستی ہوئی خورشید کی پہلی آکرکون
اطراف میں اڑتا ہوا خوش قطیوں کا نمودار
مے سائے روپ میں جوں دوپہر کو شہر پر
محویں پرندے چوٹی سے اپنے پروں کو دھوپ میں
لیکن اپناک ایک دن جب تیری دھڑکن سے کئی
ہوئی نہیں دھڑکی نہیں ماب تو مری آواز پر
لوگوں کا پیچہ ہٹک گیا اور ساتھ تیرے مر گیا
تیرا ظن شادمان اس میری مال الہ میری مال

آپ نے دیکھا ضمیر جعفری کا لب و لہجہ کتنا مختلف، کتنا سادہ اور اثر انگیز ہے۔ تو ہی جعفری صاحب کے اشعار پر کمر بستہ رہنے لگتا ہے۔ ان کے ہر شعر پر اعتبار لازم ہے۔

زمین کی دھوپ میں سب سے گنا سادہ تو ہی
اس زمیں پر آموختوں والا کئی دہلیا تو ہی

اسے مسلمان کی متبع اولیٰں ، آخریں
وہی تو ہی آئین تو ہی دنیا تو ہی عقلی تو ہی

معتد امید بھر کی زور پناہ ریت پر
اور ہاول بھی تھے تین ٹوٹ کر درسا تو ہی

یہ گلیاں دیکھیں میں نے یہ پانی پیا میں نے
تھرا تھرا ہوا میں نے اس گھڑی تک کی لیا میں نے

جعفری صاحب کے لکرو فن کے چارے کیلئے تو پوری ایک کتاب درکار ہے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ کئی کتابیں لکھی جائیں گی۔ تجلیہ و شاعری میں ان کا مقام دوسرے ہی صف میں ہے۔ جمال میر، غالب، اقبال، فیض، راشد اور مجید احمد جیسے اہل علم نے ان کی شاعری کی تمام شہم ادب میں جگہ اور ممتاز حیثیت دے رکھی ہے۔ مثلاً اردو شاعری میں ہاکی، فقہ پاکستان کی دھڑکی کا روپ دس لاکھوں میں کی شاعری میں اپنے ہر سے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ہمارے کھیت کھیاں ان کی شاعری میں سالہ بچانے جاسکتے ہیں۔ اردو کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح ان کی لفظیات فارسی زدہ نہیں۔ اقبال، فیض، مجید احمد، ان م،

راشد حفیظ اور کئی دوسرے شعراء کی کتابوں کے نام بھی فارسی سے مستعار ہیں۔ سید ضمیر جعفری کی مجموعوں کے نام ان سے بالکل مختلف ہیں۔ بابک، روا، ہال جبریل، شرب کلیم، نقش قریاوی، دوست مباد، سر ولوی سینا، شب رخت، مباد، نغمہ زار، تھکاپہ شیریں سے ضمیر جعفری کے مجموعوں کے نام کتنے مختلف ہیں۔ جزیروں کے گیت، جنگ کے رنگ، لہو ترنگ، گز شیر خان، میر نے چار کی زمین، سن کے چار، کھیاں من میلہ، یہ سب ان کی سنجیدہ نظموں کے مجموعے ہیں۔ مزاحیہ شاعری پر مشتمل پہلا مجموعہ ماضی ضمیر کے نام سے چھپا۔

انگریزی مزاحیہ شاعری کا ترجمہ انہوں نے والیجی دھڑکن کے نام سے پیش کیا۔ ناموں کے انتخاب سے ہی ضمیر جعفری کی شاعرانہ انفرادیت اور تخلیقی انجی طرح ہے۔ یہ انفرادیت اور تخلیقی انجی ان کی شاعری میں چھپا جلوہ گر ہے۔ جس طرح ظہیر اکبر آبادی کی مادی لفظیات پوری اردو شاعری کے طرز بیان اور اسلوب انکسار سے مختلف ہے۔ اسی طرح سید ضمیر جعفری کی لفظیات ان کی تراکیب ان کے لفظی پیکروں کی بت اور تراش فراش ان کے انکسار بیان کا رنگ روپ اردو کے باقی تمام شعراء سے مختلف ہے۔ ان کی شاعری میں پاکستان کے شوروں اور گناہوں کی مکار ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی مقامی بولیوں اور مقامی زبانوں کے الفاظ اس خوبصورتی سے انہوں نے اردو میں گوندھے ہیں جس طرح اردو کی کلاسیکی شاعری میں فارسی کے الفاظ رچے بے ہوئے ہیں۔ نہ صرف لفظیات کے اعتبار سے سید ضمیر جعفری صحیح معنوں میں پہلے بلاے پاکستانی شاعر ہیں۔ یہ موضوعات کے اعتبار سے بھی وہ ایک خالص پاکستانی شاعر ہیں۔ فیض اور راشد کی طرح وہ یہ بھی اور غیر ملکی موضوعات پر نہیں لکھتے۔ ان کا قلم صرف ان موضوعات پر اٹھتا ہے جو خالص پاکستانی موضوعات ہیں یا پھر کسی نہ کسی حوالے سے کسی پاکستان سے متعلق ہیں۔ مشرقی پاکستان کے سانچے پر جس طرح انہوں نے گز شیر خان کے عنوان سے ایک طویل نظم یا مختصر مثنوی لکھی ہے کسی اور پاکستانی شاعر کو اس موضوع پر اس طرح کی اور انگلیں نظم لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پھر اس سانچے پر جعفری صاحب کا وہ نوحہ جو ایک الگ نظم کی صورت میں ہے کس قدر دل دہز ہے۔

اسے وطن و وطن
تیرے دشمن ہم تیرے قاتل ہم
ہم لوگ جو اب بھی زندہ ہیں
اس جینے پر شرمندہ ہیں

یہاں پھر موازنے سے ہی بات واضح ہو گی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جعفری صاحب کی ایک اور نظم ہے جس کا موضوع فیض کی ایک نظم سے ملتا جلتا ہے، جعفری صاحب نے لکھا ہے۔

شاہ باو ات سانولے شاداب شوروں کے وطن
پیار گیتوں کی زمیں، سوہر شوروں کے وطن
جو پہاں ٹوٹے تھے وہ پڑھوٹے کیا ہوں میں
میں کہ دونوں پاس میں، گھر اچھوٹے کیا ہوں میں

چپ درختا سوچتے دھاوا مجھے آواز دو

ہم سفر صدیوں کے یادگوار مجھے آواز دو
میراں گھوڑوں کو ڈھولنے آیا ہوں میں
رہا وہی پناہ کی لہریں چومنے آیا ہوں میں

اس کے مقابلے میں فیض کے اشعار کہتے ہیں کہ :-

ہم کہ نصرت انجمنی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر میں کے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی ہے دلف سبزے کی بھار
خون کے دھبے زمیں کے کتنی رساوتوں کے بعد

جعفری صاحب صرف ان معنوں میں ہی خالص سہ فیصدی پاکستانی شاعر نہیں ہیں کہ ہر
طرح کے پاکستانی موضوعات ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں
پاکستانی اور اسلامی اقدار کے شاعر ہیں۔ بہت سے نامور شاعروں کے برعکس ان کا کوئی شعر
محض اخلاق ضمیمہ نہیں کہیں وہ شرباب کی تعریف میں مطلب لکھان نظر آتے ہیں نہ اس طرح
کے شعر کہہ کر جنسی بے راہروی کی ترویج دیتے ہیں کہ :-

تو خدا ہے نہ ہر عشق فرشتوں جیسا
وہ نون انساں ہیں تو کیوں اتنے جہوں میں ملیں

سید ضمیر جعفری اقبال کی طرح اعلیٰ ترین اسلامی اور انسانی اقدار کے داعی ہیں۔ اپنے وطن
اور اپنی قوم کے بارے میں جتنا انصاف لے لکھا ہے اور جس محبت و درد اور سوز و گداز سے
انصاف لے لکھا ہے اس کی مثال کسی اور شاعر یا ادیب کے پاس نہیں ملتی۔ بالکل اسی طرح
جیسے ان کے کردار و فعل کا یہ پہلو مثال ہے کہ ہمدانی حکومت نے انھیں وطنی بنا کر ادلی
ایوانہ بنایا مگر جعفری صاحب نے دعوت دے کے جواب میں لکھا کہ جب تک بھارت
تقسیمی مسئلوں پر ظلم و ستم نہ ختم ہو تب تک میں نہیں کرنا اور تقسیم کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں
کے مطابق حل نہیں کرنا وہ بھارت جانے یا وہاں سے ایوانہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیا
جعفری صاحب کے علاوہ کسی اور شاعر نے کبھی ایسا ردیہ اختیار کیا ہے وہاں شاعر تو
شراب کی ایک دھم کے لالچ میں بھارت پازا کیلئے کمزور رہتے ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر
لاسٹ کے لائق ہے کہ اگرچہ شاعروں کی کھنگھول اور ان کے کردار میں تفاوت ہوتا ہے مگر
جعفری صاحب جیسے اپنے اشعار میں تھے ویسے ہی اپنے کردار میں بھی تھے۔ ان جتنی سب
وطنی اور قومی محبت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ ان کی تصنیفات میں مذکور وطن، میر، پیار
کی زمین اور گزشتہ خان تو ایسی شعری تخلیقات ہیں جو از اول تا آخر وطن کی محبت اور قوم
کے غم کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں جاچا جائے تو کم از کم
دو اور مسلمانوں کے ذوال اور بھتیجی کا غم سوچوں دکھائی دیتا ہے حتیٰ کہ مزاحیہ شاعری میں
بھی یہ مبالغہ دیدنی ہے :-

دیر و دامنوں خست گر جانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں

میں بتاتا ہوں اقبال اعلیٰ عروپ کا چکا
اغل عروپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

حضرت اقبال کا شایں تو کب کا لڑ چکا
اب کوئی ایسا مقامی چانور پیدا کرو

کوئی نیچے کوئی روی کوئی اقبال پیدا کر
کہ شعروں کی لڑائی ان کے ہتھکڑوں میں ہوئی ہے

منجید و شاعری میں جو تخلیقی اعتبار سے ان کی مزاحیہ شاعری کے مقابلے میں کسی طور کم
نہیں ہے ہر جگہ ذکر ہی غم و غم کا ہے، وطن سے بے پناہ محبت کے علاوہ حضور اکرم ﷺ
سے ان کی شیطانی اور محبت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ میر کا شعر ہے :-

دور تھا غبار میر ان سے
عشق ان سے اب نہیں آتا

نعت کوئی کے ضمن میں سید ضمیر جعفری کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ قابل غور ہیں
"حضور نبی اکرم ﷺ کی نعت ایک بے حد بالک و دردت ہے، مجھ کے احساس سے بھری تو
رومن کاپ کاپ جاتی ہے۔"

سید ضمیر جعفری کی نعتوں سے کچھ اشعار پہلے نقل کئے جا چکے ہیں، اس سادگی و روانی اور
جذبات کے ساتھ لکھی ہوئی نعتیں اور شاعری کے واسطے میں اس قدر ایک ہی ہیں۔
ایک اور امتیازی اثر لایت جو اردو ادب میں سید ضمیر جعفری کو حاصل ہے وہ ان کی نثر کا
کمال ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہاں شاعر تھے یا نثر نگار۔ کرقل
محمد خان اور مشتاق احمد یحسینی دونوں سید ضمیر جعفری کو نثر نگاری میں اپنا جہ و مرشد مانتے
ہیں۔ کرقل محمد خان کا کہنا ہے کہ مرشد کی نثر کے مقابلے میں ہماری نثر ایسے ہے جیسے عظم
کے سامنے تال کا گھول۔

سید ضمیر جعفری نے چراغ امن مسرت اور حلقہ جانندہ حرری پر جو شخصیتیں خاکے لکھے ہیں وہ
اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں پر تقریباتی نویت کے
مضامین لکھے ہیں ان میں سے کچھ مضامین کتابی پیرے کے نام سے کتابی صورت میں چھپ
چکے ہیں۔ اختیاری کالم نگاری کے علاوہ جہاں بھی ان کی نثر کا کوئی ٹکڑا نظر آتا ہے وہاں روشن
اور تروتازہ ہے گویا اپنے خالق کے کمال ان کا آئینہ دار ہو۔ سید ضمیر جعفری نے بیسیوں
کالموں کے دیباچے اور قلمب لکھے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں میں اس ایک ہی طرح
ہے کہ دیباچہ پڑھنے کے بعد کتاب بے حرج اور کھل گئی ہے جس طرح حافظ اور غالب کی
غزل کے بعد کوئی اپنی غزل سنا کر شرم کر دے۔

سید ضمیر جعفری صاحب کا یہ اجمالی ذکر اس بات کی طرف اشارہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو
سکتا کہ سید ضمیر جعفری کی تخلیقات و تصنیفات کا یہ سب جس قدر وسیع و گہرا اور متنوع
ہے اس کی مثال بھی اصراف سے نہیں ملتی۔ وہ سری زبانوں سے شاعری لکھتے جو ترجمہ
انہوں نے اردو شعر میں کئے ہیں ان کی بے مثال قدرت، بیان اور استعارے کا حسن و دلچسپیت
بہت زیادہ لائق تعریف ان اپنے جملہ اردو حسن بیان کے لحاظ سے اصل سے بھی نہیں چھو کر ہے
جس طرح فقیر اللہ نے رہائیات مرغیہ کا ترجمہ انگریز زبان میں کیا ہے وہ اس وقت

جان محفل تھا خدا بخش ضمیر

ڈاکٹر سید تقی عابدی

جنت مکنی، غلہ آشیانی مرحوم و معذور ضمیر جعفری کی موت تمام دنیا نے لود و ادب کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ سید محمد جعفری اور والدہ دکن کے بعد جس شخصیت سے انجمن طراقت کی شعروطنی تھی اور جسے اہل ذوق و بصیرت بلائے طراقت کہتے تھے وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے۔ خود ضمیر جعفری نے کہا تھا :-

اچھا ہے کہ ایک دن مرنا ہے
مشکل کو تو آسان کرنا ہے

بے شک جن کی عقل تو آسان ہو گئی لیکن دوست اور احباب کیلئے ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی ۔

مرنے والے تجھے روئے گا ذلیل دروہوں

سید ضمیر حسین شاہ معروف بہ سید ضمیر جعفری یکم جنوری 1916ء کو ضلع جلم کے موضع چک عبداللہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد سید عبداللہ چار سال قبل ایران سے مکنان آئے۔ ضمیر جعفری کے پردادا سلطان عبدالرحمن بن سید محمد شاہ پنجابی پوٹھواری کے مقبول شاعر تھے۔ جن کے لیاات ”جن کے ہر ”کلمہ“ منظم تر مر تو، ضمیر جعفری نے کیا تھا۔ جمل مر حزم ” میرے شعری شعور کی پانگاری پر سید محمد شاہ کی شاعری سے چھوٹی جسے میں جگن میں اپنی ماں سے سنا کرتا تھا۔ ضمیر جعفری نے 1938ء میں اسلامیہ کالج سے بی اے کیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران فوج میں بھرتی ہوئے۔ آپ جس ہینڈ کوائف سنگاپور میں مشغول کار ہوئے اس میں کرنل فیض احمد فیض، میجر چرلز حسن سرے، کپتان، مہراشد، میجر آغا بابر، کرنل مسعود بابر، کپتان حسن مسکری جیسے ممتاز اہل قلم حضرات شامل تھے۔ 1949ء میں طبری سے استعفیٰ دے کر مختلف روزناموں کی ادارت اختیار کی لیکن دوبارہ فوج میں شامل ہوئے اور 1965ء میں میجر کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے۔ ضمیر جعفری متعدد اعزازات کے حامل رہے جن کا ذکر مضمون کے اختصار سے خارج ہے۔ 1936ء میں ”سفر عبدالقادر“ نے ہوائی گولڈ میڈل کلاس کی ایک شام کی نظم پر عطا کیا۔ 1967ء میں ”غزل کاظم آپ کی حسن خدمت اور 1975ء میں صدارتی تمغہ آپ کی حسن کارکردگی پر دیا گیا۔ ضمیر جعفری ماہنامہ ”چند سوز“ کے مدیر اعلیٰ بھی تھے جس کے مدیر عمال اور مصنف الٰہی جناب گلزار جاوید صاحب ہیں۔ آپ نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور آپ کا کام پاکستان کے تمام صوبوں کے نصاب میں شامل ہے۔

مرحوم کا شمار اسلام آباد کی پہلی اہمیت رکھنے والے اشخاص میں ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری کو جگن ہی سے ملی، سماجی، ادبی اور شعری لگاؤ تھا چنانچہ گورنمنٹ ہائی سکول جلم کی ساتویں، آٹھویں جماعت ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور اپنے اسکول کے ملک الشعراء تسلیم کئے جانے لگے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ”صحیح معنوں میں ادبی اور شعری نشوونما کالج میں ہوئی جہاں میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی لیکن ابھی کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ لینے کا خیال آیا البتہ استفادہ سب سے کیا اور اب تک کرتا ہوں۔“ ضمیر جعفری نے پہلے سنجیدہ اشعار کئے لیکن چونکہ طبیعت کا میلان طنز و مزاح کی طرف تھا تو مزاحیہ شاعری کو اپنا مرکز بنایا۔ جس میں ان کی ضمیر کی تین اور سنجیدہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ خود کہتے ہیں ”میں تو مزاحیہ شاعری کو سنجیدہ ہی سمجھتا ہوں کیونکہ اس کی بنیاد بھی تو آنسوؤں پر ہی ہے، یہ مسکراتے ہوئے آنسو ہیں۔“ آزاد شاعری کے بارے میں ضمیر صاحب فرماتے ہیں ”مجاز ہوا کے ظہر ادب بھی پودے کی طرح سوکھ جاتا ہے، آزاد شاعری نے اپنی اہمیت کو منہ الیا ہے اور یہ ادب کی ضروریات میں سے ہے۔“ ضمیر جعفری نہ صرف ایک مقبول شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بلکہ صحیح شخصیت تھے باہر وہ ایک نئی صنف شاعری ”پستون“ کے خالق بھی ہیں۔ ایک پستون ملاحظہ کیجئے :-

بعد بہت آنج بہت عم تری یاد آگئی
جیسے گھر جانے اچانک ہنس کے جھلک میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پہ دھونٹا آجائے راک
یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا مچھی

قدیم شعراء میں نکلے اکبر آبادی اور غالب کے یہاں طنز و مزاح کے بہت حسین اور کامیاب نمونے ملتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنے گرد و فن کی کامل حیثیت میں خالص طنز و طراقت کا شاعر کے جانے کا مستحق ہے تو وہ اکبر الہ آبادی ہیں چونکہ شاعری سوسائٹی میں جہم لیتی ہے اور آسمان سے نازل نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر خطہ اور ہر دور میں یہ رحمت مشکل سنجیدہ اور طراقت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ خود ضمیر جعفری فرماتے ہیں ”مزاح زمین کی چیز ہے، طراقت آسمانوں میں نہیں ہوتی، انسان اس وقت بالغ ہوتا ہے جب پہلی بار اپنے لوہے ہنستا ہے۔“

چند طنز و مزاح کے اشعار جن میں حسن اور طراقت بھری ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

تجسے کو سپے میں یوں کھڑا ہوا ہوں
جیسے ہائی کا کول کچھ ہوں

مسکندہ جانی -

ستادہ نظر نہ جیوں نہ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نصیب نہ رہے ہیں
نہ منزل نہ جاو نہ کوئی لڑوہ
رضا کار کم یاب لہذا زیادہ

جان مفضل تھا خدا جیسے ظہیر
اب تو اک مدت سے شوہر ہو گیا

چند سنجیدہ، مشفق، انصافی اور ملی الشعار ملاحظہ فرمائیے -

حسن ہر روپ میں کافر ہے یہ مانا لیکن
اک قیامت ہے جہائی میں لہر کی صورت

دل میں ہر وقت کوئی شکل بنائی رکھا
اپنے کمر کا کوئی گدھن نہ نکالی رکھا

جو بھی عورت ہے خوبصورت ہے
یہ مری روح کی ضرورت ہے

بادشاہوں کو کیسے بے شک نظر آیا نہیں
کون سے رستے میں درویشوں کا گھر آیا نہیں

اس کے ہال د پ کو خاک و خس کی رسوائی ملی
جو پردہ لڑ سکے اور شیش پ آب نہیں

تکلیوں کے پ پ بھی کچھ سرسری تحریر نہیں
ہم کو اس اٹا کے پڑھنے کا ہنر آیا نہیں

چند س کے مدیر مسئول گلزار چلو کیلئے کہتے ہیں -

اپنی فہم نہیں ہے جز ایں قدر مجھے
اک شخص تھا کہ میں نہ سکا مگر ہر تجھے

میری بیوی قبر میں لٹتی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

میں ۲۵ ہوں ذوال الی یورپ کا پلاک
اہل یورپ کو مسئلوں کے گھر پیدا کرو

تھی انہی لڑائی فضاں میں ہی ہانک احمد
ہو گیا سرخوں میں رہا ایک افسے پ فدا

مٹی رٹ پ بڑی لب پر چھالے نگے پاؤں میں
چوہا جب لے کے آیا اپنی بھیڑیں گالوں میں

صدیاں بگڑ ایسے لمحوں کی تھیک پ زعمہ رہتی ہیں
مانیں دوزخی عقل کو اور کانہیں ہاتھ دھواں میں

کچ مکھ جو صورت ایام ہے
یہ چٹانوں کے دھریں کی شام ہے

یہ کس بازار میں بچے کی خاطر آ گیا ہوں میں
ہر ہر قیمت پ کو یا اپنی قیمت پا گیا ہوں میں

گھرہوں کا محسوس رہتا بھی ابھی بات ہے
دلتے میں بے خبر رہتا بھی ابھی بات ہے

جب لقا لہوں پ سہل جاگیں زنجیر چٹا پاؤں سے
کچھ کوئی طوفان آئے گا جب چائے اٹھے دریابوں سے

یہ بہت کم ہے جہاں کی تیرگی کے واسطے
کوئی سورج اور بادب روشنی کے واسطے

اپنے بچے احتیاط کے ہم -

ہم نے چین میں تجھے پارا وطن کے نام پ
بارک اللہ آج دے ڈالا وطن کے نام پ

پاکت لشکر کا ہوش جا مبارک ہو تجھے
لہنا پر چم قہام کر چنا مبارک ہو تجھے

زندگی کا اس سے بڑا کڑ بائین کوئی نہیں
تجری وادی سے مقدس جہنم کوئی نہیں

پاکو اور اشعار ملاحظہ کیجئے -

ہم اس مضمون کو مرحوم کی نظم ”معافی نامہ“ پر ختم کریں گے جو انہوں نے اپنی دہم کی
محبت اور فداکاری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے۔

دیکھتا ہوں روز و شب
اک کھجور کی چٹائی پر دعا کرتے ہوئے
آنسوؤں سے ہڈی کا حق ادا کرتے ہوئے
دکھ میں سکھ کی طرح شکر خدا کرتے ہوئے

ہاتھ اس کا تھا کہ جس کو قہم گر چٹا رہا
اس کے چہرے سے مرے گھر کا دیا جلتا رہا
میرے ہنگل کے سفر میں میری بستی کا دھواں
میری جہاں، میرا جہاں

باز محبت ہم یہ سوئے دوست

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

موتوں کے سوا سے گھٹا ہوا
قافل کے پاس کچھ نہیں شمشیر کے سوا
حریت شمشیر سے پیچنے کے واسطے
کیا راستہ ہے اس کا شمشیر کے سوا

رہنے کے اب اس شہر میں اہلک نہیں ہیں
سفاک ہوسٹ بھرتے ہیں اور سفاک نہیں ہیں

مٹنے باہم بڑھتے ہیں گم چلنے والی نگاہوں میں
شہر میں جتنی بھولا گھر کے اتنی ہی تھالی ہو گی

اپنے بچے انہیں کے لئے۔

مختصر ہے آئی رات
دوستانہ نہیں تھی

حلقہ ارباب ذوق کے نیویارک سے

اردو شعروادب کے علاوہ تخلیقی عمل کے عالمی رجحانات کے بارے میں ایک
خوبصورت اور جامع ادنیٰ جریدے کی ناگزیر ضرورت

ماہنامہ ذراویہ

کی صورت میں پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ خوبصورت جریدہ حلقہ ارباب ذوق جیسے
مؤخر ادنیٰ فورم کے ”احباب“ میں پیش بہا اضافہ ثابت ہوگا۔

اشرف میاں، سیکرٹری، حلقہ ارباب ذوق، نیویارک

سو گئے داستاں کہتے کہتے

جوہر میر

جناب سید ضمیر جعفری کے ادبی اور شعری مقام کا تعین ان کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ وہ صغیر کی فن نگاری میں جنہیں ایک عرصہ کا ضمیر سمجھا اور مانا جاسکتا ہے۔ وہ ادیب و شاعر کے علاوہ مؤرخ بھی تھے۔ ایسے مؤرخ جنہیں تاریخ کے ساتھ ستر کرنے کا اعزاز حاصل رہا۔ جنہیں ہم اپنی ادبی شعری اور سیاسی تاریخ میں سنگ میل سمجھتے ہیں۔ جناب جعفری انہوں نے اپنی تحریروں اور اپنی فنی مکتوبات میں تاریخ کے بعض ایسے لمحات سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے جو ہمارے روایتی مؤرخین سے قلمبند نہیں ہو سکتے۔ جعفری صاحب کی یہ "تاریخ بھاری" شخصیات سے منسوب واقعات اور واقعات سے متعلق شخصیات کے بارے میں ہے۔ اپنی مختلف تصانیف میں انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو جو آگاہی دی ہے وہ کسی اور نے نہیں دی۔ وہ اپنی ذات میں ایک ایسا انسان تھا جو ہم سے کماحقہ اعتقاد نہیں لایا جاسکتا۔ فنی مکتوبات میں ان کی بیان کردہ تاریخ تو محض حقائق کی جانکی ہوئی ہو سکتی ہے۔

جعفری صاحب سے میر کی اور حلقہ ارباب ذوق کے باقی احباب کی شناسائی نیویارک میں ہوئی۔ کوئی دو دہائی سال پہلے جب دو نیویارک تشریف لائے اور کچھ عرصہ یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ نہ صرف حلقہ ارباب ذوق کے روح رواں تھے۔ ہر اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ بعد ہر میر کی شام میر سے غریب خانے پر بھی تشریف لاتے تھے۔ جسے انہوں نے جبر و سیر جبر و قہر خوانی کا نام دیا تھا۔ ان مکتوبات میں ان کی ذہنیاتی اور شخصیات کے علاوہ خود ان کی ہم جہت اور ہمہ گیر شخصیت سے آگاہی ہوئی۔ رات گئے تک جدید و قدیم ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ اردو ادب کے مشاہیر کے بارے میں ہمیں ان سے بہت کچھ جاننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ علامہ اقبال، قائد اعظم، مولانا حسرت موہانی، سر عبد القادر، مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مراد، مولانا عبد الحمید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، محمود شیرانی، عبد الحمید عظیم، حاجی الحق کے علاوہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد اور مرحوم مشاہیر کے تخلیقی مقام و مرتبے کے بارے میں میر حاصل آگاہی ہوئی۔ سیاسی شہس بھی ہو اگر تھی۔ مارشل لاؤں کے نواسے سے جب ملک کو بچنے والے نقصان اور پاکستان کے سیاسی خلفشار پر رائے دی گئی تو جوبہ و نہ ہونے کے بل بوتہ پر بہت فائدہ پیشانی سے تنقید جاتا کرتے تھے۔ وہ ہمیں قائل کیا کرتے تھے (اور ہم قائل ہو بھی جاتے تھے) کہ سب کی سب فوج اقتدار پسند تھیں۔ مارشل لا پسند تھیں اس میں اکثریت پیشہ و افراد کی ہے۔ مطلق کی سرحدوں کے خارج میں یقین رکھتی ہے۔ فوجی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دنیا، الحق ان کے ساتھ رہے تھے وہ اس کی بھی ذاتی غویبوں کے اعتراف کے باوجود اس کے مارشل لاہ اور اس کے کارناموں پر تنقید کیا کرتے تھے اور حاضرین کی تنقید سے اطلاق بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی

تعارض مسائل پر بحث بھی ہو جاتا کرتی تھی اس موقع پر وہ بڑے کا حق استمال کیا کرتے تھے لہذا ان کے بارے میں یہ پابندی نہ جانی جاتی تھی۔

ان کی مصداق میں منعقد ہونے والی ان شعری نشستوں میں ہر دو کام سنانے کی شرط تھی وہ خود بھی ہر جمعہ کی نشست کیلئے ہر دو غزل لاتے تھے اور باقی سب بھی۔ ان کا کتا تھا "فنی غزلیں" انہوں نے نیویارک کی ان نشستوں کی وجہ سے لکھی ہیں۔ اتنی پاکستان میں ہر سال میں نہیں لکھیں۔ ان مکتوبات کیلئے لکھی ہوئی ان کی غزلیں ہم سب کیلئے ان کی مزاح نگاری کی شہرت کے برعکس بہت ہی انوکھی آہنگ کی حامل تھیں۔ وہ ہمارے اصرار پر ہی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ وہ اپنی افتادہ طبع کے خواستے سے تو کئی حالات کا خاکہ لکھتے اور ظہور مزاح کی طرف راغب رہتے تھے۔

جعفری صاحب کی شاعری کچھ تو کلاموں، مزاحوں اور کسانوں کی طنز تھی ہے۔ وہ سیکولر سوچ اور فکر میں یقین رکھتے تھے۔ نیویارک میں کئی ادبی فن کی غزلیں خاص طور پر ترقی پسندات پسند کیلئے کی جا رہی تھیں۔ ان کے اشعار کے موضوعات کلی تھا۔ سے تو منظرہ ہی تھے وہ فوجی رہتے تھے اور فوج کے کردار اور اس کی اہمیت کے منظرہ تھے اس کے باوجود ان کی غزل کا یہ شعر سن کر ہم سب کو حیرانی ہوئی تھی۔

منازل امن عالم کی نیت لوگ ہوتے ہیں
وہاں نہیں ہیں وہاں تھا جہاں فکر نہیں ہوتا

ہم سب نے جب ان شعری نشستوں میں دل کھول کر داد دی تو اس کرکے ان کے تم سب نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں اور غریب خانے کی مکتوبات کے بارے میں وہ ہمیں بہت قدرتی کے ساتھ سفر جاری رکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ پاکستانی اہلادب کیلئے لکھے ہوئے کلاموں میں نیویارک کی ادبی سرگرمیوں کا اظہار کیا کرتے تھے۔ علامہ ارباب ذوق کے احباب کیلئے ان کی یہ فہم اور شفقت بعض حضرات کیلئے تھی کہ وہ بھی لیکن ان کی شہسوری جگہ بازی کو وہ نہیں کرال دیا کرتے تھے۔ سید ضمیر جعفری صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، کئی انہوں پر پچھا وہ اچھا جبر و سیر جبر و قہر کے ساتھ ہر ادبی کی سچا تھا۔ وہ ان کے شعریات کو سنا دیتے تھے۔ عاجزی اور ذہنیاتی ان کا روزگار حیات تھا۔ سچے اور کھرے انسان تھے۔ سبکی، سبکی اور یہی انہیں ان کے واقعات سے ماورا تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دعاگو تھے۔ مزاح نگار تو وہ تھے ہی لیکن وہ مزاح گو بھی تھے۔ موقع ملنے کی سب سے ان کے فحش سے اپنے اپنے لفظ لکھتے تھے جنہیں سن کر فنی مذاق کرنا مشکل ہی ہو چکا تھا۔

بیادِ سید ضمیر جعفری

جوہر میر

دوستوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی امداد میں بدھ جاتے تھے۔ انہیں
موصول دیتے تھے اور ان کی مشکلات کے ازالے کیلئے اپنا اندر دھونے استعمال کیا کرتے تھے۔
پاکستان کے کئی ادبی پرپے ان کے قلمی اور شخصیتوں کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان کی
پیشانی پر جعفری صاحب کا ہم ہی ان کی پڑائی کی شدت سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جعفری
صاحب جیسی بلند قامت شخصیت کے ادبی، شعری اور انسانی اوصاف کا احاطہ ایک مضمون
میں نہیں ہو سکتا۔ نیویارک میں ان کے مداحوں کو تو انہیں جاننے اور سمجھنے کا زیادہ وقت
میسر نہیں آیا۔ یہ تو ہم سب کی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ان کی پوری میں جوائی کی کچھ باقی رو
جاننے والی راتیں میسر آئیں اور یہ ان کی حمایت ہی تھی کہ نہ کون اپنی آخری پونجی میں کسی کو
شریکہ کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ان کا یہ شعر ہے

کچھ جوائی کی قمیص باقی قمیص میر میر میں
لوٹ کر ہم آگئے ہیں شہر جوہر میر میں

وہ وطن کی ہان تھا پہچان تھا
سر سے پاؤں تک وہ پاکستان تھا

دگرگوں جیسا کوئی انسان تھا
اس کے سائے میں بڑا تیراں تھا

وہ جیسے کھوتا بہت مشکل رہا
وہ جیسے پاؤں بڑا آسان تھا

اس کی محفل میں نہ تھا غم کا غور
خفگیاتے قندوں کی کان تھا

بھر گیا دامن محبت سے بھی
وہ نچی تھا اور وہ دھوکاں تھا

ملاقاتِ محبت اس کی شاعری
"نکلتی" وہ تھا مگر دھوکاں تھا

مکملیں مسوئی تھر آئیں نہ کیوں
اک دہی تو مکتوں کی بان تھا

اب جو دوتے ہیں ابھی تو یہ کھانا
وہ ابھی کے اور کا دریاں تھا

دراصل اہل نیویارک کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق کا ثبوت ہے۔ ان کی محبت اور
شفقت کا آئینہ دار ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے سفر حیات کے خاتمے کا اعلان بھی
ہے۔ کوئی سچا کھرا ادیب، وطن ضمیر انسان ہی اپنے بارے میں ایسی بھارت دے سکتا ہے۔
مجھے یاد ہے کوئی تاریخ دو سال پہلے جب انہوں نے پاکستان واپس جانے کا اعلان کیا تھا تو ہم
سب لوگ وہ مگے تھے۔ کسی ادیب اور کو قافلے کے مدیر میری ایک غزل کا مقطع یوں نازل
ہوا تھا۔

جوہر خطاب ہوں گے مزی دھوپ کے سحر
ہوں گے نہ جب ضمیر یہاں سا کہاں سماں

میرے اس شعر کے جواب میں انہوں نے اپنی غزل میں یہ شعر عطا کیا تھا۔

کشتِ وطن پاک لئے جاتی ہے ورت
رہے ابھی جوہر ترسے سنگ اور زیادہ

یہ جب کی بات ہے جب ان کے واپس آجانے کی امید بھی تھی، یقین تھا کہ وہ کچھ عرصہ
کر اپنی دگر و گرواپس لوٹ آئیں گے مگر اب کے وہ جس سفر پر روانہ ہوئے ہیں یہ کھنڈہ سفر
ہے اور یہ احساں بہت، کھی کر دینا والا ہے کہ وہ اب بھی واپس نہ آئیں گے۔ یہ نہیں یہ
شعر کہیں کا ہے لیکن اسی موردِ تمنا کے بارے میں ہے اور بہت ہی سچا ہے۔

جانے والے ابھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے



ایک دو ایکڑ زمیں کے ہاشکاموں میں تھے ہم

اک جانِ نادہ کے پروردگاروں میں تھے ہم
 اک نئی دنیا کے نورستہ کناروں میں تھے ہم
 چاکرِ دامن تھے جب جہاں تھے ہم نہ جانے کن ستاروں میں تھے ہم
 لیکن اے دریا ترے آباد کاروں میں تھے ہم

ادبشنی! اے روشنی! ترے گواہی کئے
 آمروں کے سارے کالے گوشواروں میں تھے ہم
 مذہب اپنا پناہ جے شک مگر یہ بھی کرتا تھا
 سجدوں میں مذروں میں گروہ واروں میں تھے ہم

اے وطنِ اترے تقدس کے سرود آرا تھے ہم
 اے زمیں! ترے سُریلے آبشاروں میں تھے ہم
 کچھ نہیں ہے اپنا طرز زندگی اسی کے سوا
 جس جگہ یاروں نے دی آواز یاروں میں تھے ہم

تسہ خشتِ بختی ہے یہ کسا بُرا الزار ہے
 شامروں - حدوت گروں تو نگاروں میں تھے ہم
 دنِ شقت کی چائیں ترڑتے گزرا، مگر
 شبِ شبستانوں کے ریشم گلِ عذاروں میں تھے ہم

کھیت تے سر سبز جن سے - جن سے آباد پشور

چند لکڑیوں میں رہیں - لاکھوں ہزاروں میں تے ہم

ہم پہ گزرا ہے پیر پشیمانی یہ جلتی صدی
برق کی زاد پیر کا اندھیرے کے حصاروں میں تے ہم

یاد آئے گا یہ جو ^{سنے} ہیر کا حجرہ پلیر

جس کے روشن رتیلوں کے شب ہزاروں میں تے ہم

نوبارک

نہ آشوب کو کے ملاقات آج کا شام خاب - جہاں

(۲۰، جنوری ۱۹۹۷ء)

سید ضمیر جعفری

غزل

ایک وہ ایک زمین کے کاشکاروں میں تھے ہم
اک جہان تازہ کے پروردگاروں میں تھے ہم

اک نئی دنیا کے نورست کناروں میں تھے ہم
جب جواں تھے ہم نہ جانے کن ستاروں میں تھے ہم

چاک دامن تھے پریشاں روزگاروں میں تھے ہم
لیکن اے دنیا ترے آبادکاروں میں تھے ہم
کچھ غمیں نے اپنا طرز زندگی اس کے سوا
جس جگہ یادوں نے دی توار، یادوں میں تھے ہم

روشنی! اے روشنی! تیری گولئی کیلے
آجروں کے سارے کالے گوشواروں میں تھے ہم
کتنی خوش بختی ہے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے
شعروں، صورت گردوں، نفو نگاروں میں تھے ہم

مذہب اپنا اپنا تھا ہے شک، مگر یہ بھی تو تھا
مسجدوں میں مندروں میں گوردواروں میں تھے ہم
دن مشقت کی چنائیں توڑتے کڑوا کر
شب شبستانوں کے ریشم بھی مزاروں میں تھے ہم

اے وطن! تجھے تقدس کے سرو آراء تھے ہم
اے زمین! تجھے سریلے آبشاروں میں تھے ہم
کھیت تھے سرسبز جہنم، نہن سے تھے آباد شہر
چند لوگوں میں تھیں، راکھوں ہزاروں میں تھے ہم

ہم پہ گزری ہے "بھراشیم" کی یہ جلتی صدی
دلی کی رو پر، اندھیرے کے مزاروں میں تھے ہم

یا آئے گا یہ جوہر یہ کا جبرہ
جس کے روشن رنگوں کے شب گزروں میں تھے ہم

حضرت اقبالؒ سے ٹیلی فون پر بات چیت

سید ضمیر جعفری

ان کے ٹیلی فون پر ایک آسمانی کال سے
 اتفاقاً یہ سچی "کھل" حضرت اقبال سے
 آپ نے فرمایا "نہا" مرض دامن کا سال ہے؟
 مرض کی سنی الیال تو ہڑ بھگ ہے ہڑ بھل ہے؟
 پوچھا وہ برش جو دی تھی شہر شایین کو؟
 مرض کی شاہیں ہے اب امریکیوں کی "جین" میں
 ولے "ملی" اتھا ہر نظم اور جہ د یقین؟
 مرض کی "طامہ" صاحب اتنی جڑیں ہیں نہیں
 بولے میں نے حسرت آئیں کی تقصیر کی
 مرض کی ہم نے اسی شے کی تھی توہین کی
 ولے: ماشاء اللہ اب افراط مال د زر میں ہے
 مرض کی ہے تو نگر اس لٹیروں کے گھر میں ہے
 ولے: ستا ہوں مسلمان مساواتی ہوا
 مرض کی سر آپ کے بعد اور طبقاتی ہوا
 ولے: مدد افسوس "ضرب کھسار" نہیں
 مرض کی مرشد ہیں اب بنگ ب پانا نہیں
 مر: سو میں کا بھی پوچھا سر ہے یا زور ہے؟
 مرض کی امریکہ کے نزدیک "دہشت گرد" ہے
 پوچھا جزیہ جو جمال الدین افغانی میں تھا؟
 مرض کی پلو تو ایک سندھ کے پانی میں تھا
 پوچھا کیا اس عالم اسلام کے شام د "حر"؟
 مرض کی سارا عاق مصعب تا کا فخر
 پوچھا نگر میں تو ہوں کی پونپال افلاک کی؟
 مرض کی اب تک تو اس اپنی تباہی پاک کی
 مختلف کرنے ہی والے تھے وہ پلو اسرار میں
 مسئلہ میں دلعبا محسوس کیا ایک "ایفہ" "سکھت"؟
 کہ جسے ایک بات انکین ماہ فون شان سے
 کوئی انسان م نہیں ہے "دوسرے" انساں سے
 مرض کی میرے لئے بھی ایک پتہ بدو غن
 ولے: تو میرا نہیں جانتا نہ من اپنے تو "ن"

سید ضمیر جعفری

۳۳۰ ی بکرات لائنز

لیکچر کراچی

ٹیلی فون: ۳۹۰۱۲۲۸

۱۹۹۷

اشرف بیوں قلب

میں حیدر جہلی سے ملے۔ یہ کہ

کوئی حذو ان کو مدد ہی نہیں۔ یہاں سے ان سے آج

کا تذکرہ کر آیا ہوں۔ اگر آپ کو اس سے ملے ہیں دلچسپی ہو

آزاد سے یہاں سے ملے ہیں۔

معدہ دوز کے لئے اسے آباد کر دیا ہوں۔

میں رہنمائی نے بار بار ایک شام ناؤ رہا۔ انتشار عادت

یاد رہے کہ حینہ انٹر لود مارنا ایسا کہ

کی گھنٹہ ۲۰۱ کی ایک شہر ہے۔ میں نے وہاں رہی ہیں

آپ جیکو آئے تھے۔ یہ تو مارغی انتہا

تعمیر کی جگہ

۱۹۹۷

مستند ہے۔ لہذا جس طرح کہ عبادت الہیہ

وہ فرشتے پر سناٹا پڑی۔ وہ عبادت تریب

سناٹا ہی مرد تھے جس کے تائیں ان کا جہاد

کمزور ہیں۔ نہ تو دین تریب میں ہر مشکل

آج ہے۔ شکیں، لکھنے کی نانی ملتے کی گڑبگڑ

کے مع بدلے۔ یہاں کے عسکریں میں بہ زیادہ کے ملتے

ماتہ چرچا ہے۔ شوکت پنی یہ وہ شہل آباد میں

مردم تھے تو ہمارے فرزند ہیں یہاں وہ کاف ہے

لکھنے میں آباد ہیں۔ ذکر اعلیٰ الہی جادید کو۔

جام
۱۹۷۱

سید ضمیر جعفری
۳۳ یگمراٹ لائنز
ملیر کینٹ کراچی
۳ فروری ۱۹۹۷

اشرف میاں صاحب!
میں حمید جھلمی سے ملا۔ آپ کا کوئی خط ان کو ملا ہی نہیں۔ میرا حال میں ان سے آپ کا تذکرہ کر آیا ہوں۔ اگر آپ کو اس معاملے میں دلچسپی ہو تو ان سے میرے حوالے سے رابطہ کریں۔
دو چار دنوں کیلئے اسلام آباد سے ہو آیا ہوں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ہمارے ساتھ ایک شام منا ڈالی۔ افتخار عارف پوچھ رہے تھے کہ حنیف انگر اور مامون الیمین کے محاربے کی گلن گرنج کا کیا رنگ ہے۔ میں نے عرض کیا وہی جو آپ دیکھ آئے تھے۔ یہ تو تاریخ انگلستان جو ”پھولوں کی جنگ“ “War of Roses” کے نام سے مشہور ہے اور ایک طویل عرصے تک جاری رہی۔ احمد فراز سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ ہماری تقریب میں بھی موجود تھے جس کیلئے میں ان کا بے حد شکریہ گزار ہوں کہ وہ تو اپنی تقریب میں بھی مشکل سے آتے ہیں۔ فکیل کاظمی صاحب کی زبانی حلقے کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ وہاں کے حلقوں میں بھی آپ کے حلقے کا خاصا چرچہ ہے۔ شوکت فہمی عید پر فیصل آباد میں متوقع تھے مگر کاہنم تحریرت ریسال ان کی خبر ہے اور نہ اسلام آباد میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کو۔

والسلام
ضمیر



سید ضمیر جعفری، محترمہ ان، شوکت فہمی اور جہر میر کے ہمراہ

سید ضمیر جعفری

۲۴ ی گجرات لائسنز

ملیر کینٹ کراچی

ٹیلی فون ریکس : ۳۹۰۱۲۲۸

۳۰ جنوری ۱۹۹۸

میر کا سون چہرہ پر صلب و جد

روا بہ صفتہ رو بہ ذوق !

سدم کبت !!

فجاء شکیل کا نکلیں صیہ پر رو بہ سون آئے

ترہیں زندہ ہیں مکتوں کا ایک یا ریکارڈ " جھم جھم
کرنے چند گسوں کائے جھے ملنے کراچی آگے - اور

جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو وہ میرے سامنے ہیں

اور میں بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ "لوگوں کے

کا نکلیں صلب کے بالادھار ہیں ملتہ رو بہ ذوق" کے

امیدیں ہیں آپ کے درمیان بیٹا ہوں - میرے لئے چہ

ساتھ بڑا سہرا ہیں - شکیل تو مشورہ میرا چھوٹا

نگر آپ کے چہرے میرے ذہن میں چمکتے ہیں

علامہ

ایسا رہا

۱۹۹۸

نہت حد تک چھوٹے ہیں وہ میرے گھر پر چادر

کو دور ہوا دیکھو

سید ضمیر جعفری
34 سی گجرات الاسٹریٹ
ملیر کینٹ کراچی
3 فروری 1997

میر کا ملاں جو ہر میر صاحب وہ جملہ حلقہ ارباب ذوق!

سلام محبت!!

جناب فکیل کاظمی عید پر راولپنڈی آئے تو میری زندگی میں مہجوں کا ایک نیا "ریکارڈ" عطا کرنے چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کراچی آگئے۔ اور جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں بھی اس طرح محسوس کر رہا ہوں کہ "مرداؤے" میں کاظمی صاحب کے "بالا حصار" میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میرے لئے یہ چند ساعتیں بڑی سنہری ہیں۔ فکیل تو تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے مگر آپ کے چہرے میرے ذہن میں چمکتے رہیں گے۔

والسلام

آپ کا اپنا
ضمیر

نزدہت صدیقی سے کہیں وہ جاوید گلزار مدیر چہار سو کو موار بھیجائیں۔



جعفری صاحب احباب کے ساتھ

آغا جان امجد حسین کی دعا کریں

”ایک شعر آرزو کا شوق (بہتر نسخہ شلا) لکھتے اور اس کے ساتھ اتنا پیسہ دیا لکھتے کا ایک صد چار
شکر یہ بھی اور اکروں تو کم ہو گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، آپ نے تو میں کو شمال کر دیا۔“

جو ہر میر صاحب اپنے خطوط میں (جو اس کتاب میں شامل ہیں) آپ کو آغا جان، شاہ صاحب،
میر صاحب، ویدی صاحب کے القاب سے یاد کرتے ہیں، ہم آپ کو آغا جان کہیں گے، تو
آغا جان!

بب سے ”ایک شعر آرزو“ ملی (بہتر ایک پٹھان کی تعریف کے ماتے سے) ”ملا“ ہے، اس
نے مجھے کوئی اور کام نہیں کرتے دیا، نیویارک میں ”میر خان“ یعنی جو ہر میر کا گھر ہمارے
لئے ”میر خان“ بن گیا ہے کہ ہر ”میر“ کی رستہ ان کے ہاں (جسے ہم ”خرو قصہ خوانی“ بھی
کہتے ہیں۔ چند درویشوں کا رہنما رہتا ہے، اس محفل میں بڑے سیاست دان، دانشور اور
مظہر زبیر جیسے بڑے ہیں، ایک سے ایک اہم قوی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے، مگر گذشتہ ”میر“ کو
”ایک شعر آرزو“ کے سوا کوئی مسئلہ یا شخص ”خرو قصہ خوانی“ میں داخل نہ ہو سکا، نیویارک
میں ڈاکٹروں کے کنونشن میں آپ کے تیار ہونے نے ہمیں چو لکایا تو تھا جس کا ذکر ہم نے
روزنامہ ”خبریں“ لاہور میں اپنے کالم میں بھی کیا، مگر یہ اللہ عز و جل کتاب سے ہوا کہ آپ
”کٹ پیس“ Cut Piece ہی نہیں بہتر ”تھان کے تھان“ ایسے شوخ و چٹکے رنگ کے
نکالنے پر قادر ہیں، ایسی دلچسپ کتاب کو ہم تو سے ہوئے تھے، اس کتاب میں تو کئی کتابیں
ہیں، یہ تو گویا آپ نے تھانوں کی ”ہاں“ لکھ دی ہے۔ ایک ہی رنگ میں کئی ذائقوں والی
”دروانی“ پکا ڈال، جو ہر میر نے آپ کی انگی باغیڑی تو پر و پیر غصہ اعمال نے تمام لی، اور
دونوں اپنی اپنی جگہ پر روپ کے سند رکھ، کتاب نے نہ مجھے کوئی کام کرنے دیا نہ پٹھان سے
لکھنے دیا، جس طرح محمود غزنوی کے ہندوستان پر متر و مقلوں میں سومات سنگ غزنوی اس
کے ساتھ رہا، اسی طرح آپ جہاں بھی ہوں پٹھان آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ آپ کو پٹھان
نے ”میر“ آپ نے پٹھان کی سنی کے ذمے دے کو ”سوئی“ بنا دیا۔ سچ کہتا ہوں کہ
کتکب کا بچاؤ پڑھنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو ”نویارک“ مجھے پٹھان سے مجھ جیسے ”سچ“
معلوم ہونے لگا۔ شعر صرف دیواروں کو نہیں، دیواروں کے پیچھے اس گھر کو کہتے ہیں، جو
گھر کے اندر ہوتا ہے۔ شعر دیواروں کا سایہ نہیں، دیواروں کی چھائیں ہوتا ہے۔
نویارک کی دیواروں کے آگے جو کچھ بھی ہو، پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ لیکن قد میں اپنے
بہت سے سادہ جوتوں سے مجھ کو گھر کا گرد و گردی میں سب سے عظیم تھا۔ پٹھان کی گھوڑوں
میں جہان انسانی کی نفی صدیاں ”بھارت“ تو جی رہی ہیں، وسطی ایشیا سے آنے والے قتلوں
کے موت اپنی سوجھ بوجھ میں اسی شعر کے باروں میں اچھلتے رہے، میں تو کہتا ہوں اگر وہ فیہر
دہشت گرد پاکستان بھی شاید معرقت وجود میں نہ آتا، آپ نے اس شعر کی کہانی اس حجت اور

ہنرمندی سے بیان کی ہے کہ انٹیس ہونے لگی ہیں۔ ڈاکٹر امجد لکھتے رہو کہ تمہارے قلم سے
درو خیر سے آنے والی تازہ اور طاقتور ہوا آ رہی ہے۔ اپنی ہند کو کی گدائی بیوہ کا دی سے آپ
اردو کو ایک نئی محاسن دے رہے ہیں، محاسن کے علاوہ ”انہایت“ کی چاندنی بھی۔ یہ
درو خواست بھی کروں گا کہ مزاج کم کر لکھیں، مجھے آپ کے اندر ایک دوسرا شفیق الرحمان
دکھائی دے رہا ہے۔

اس کتاب میں میری محبت کا یہ عالم رہا کہ جب کسی نے کچھ غلط ڈالنا چاہا، ہم نے اپنا یہ
شعر منگوا دیا۔

موت سے کہ دو الٹی جردن در فصری رہے
زندگی کی محفل زیبا ہے میرے سامنے

ایک مرحبہ تو جب بیوی چائے کی پیالی لے کر آئیں تو میں نے انہیں بھی یہ شعر سنایا، مگر
شکر ہے کہ وہ بھانگو ان اتنی اردو سمجھتی ہی نہیں۔ آپ جتنے بڑے دوا دار و دالے ”چاروگر“
ہیں، اتنے ہی منفرد ادب کے ”شانوگر“ بھی ہیں، عارفہ دل کے معانی کی حیثیت سے
ماشا و اند آپ کی بڑی شہرت ہے مگر آپ تو دلوں کے فارغ بھی ہیں، عارفہ دل کے حوالے
سے اپنی ایک چھوٹی سی نظم نقل کرنے کو دل چاہا کہ یہ ہم نے CMH لاہور پبندی کے شاعر
سر بن (لاہور جزل) محمود الحسن کے میز پر لیٹے لیٹے ذہن میں کسی تھی۔

دل در تنک
اے مرے دل
اے مرے دل کو محرم نہ سکے آشنا
تو نے آخر تو تنک آخر شبی ”تو نے دی مجھے
میری تھی تو صورت خود فراموشی کے بعد
آن پہلی وار تنک دے دی مجھے
لیکن اس دنیا کی تار و بار بازی گاؤں میں
تھیلنے کو کس قدر اچھی ”تنک“ تو نے دی مجھے
بہرہ دیر نہ تیرا شکر یہ!

نویارک سے چائیں پار ہے، سامان اپنی کاندھ حار کھاتے، سچ پوچھنے تو جو ہر میر کی محبت
لکھنے نہیں دے دی، اگلے روز ایک غزل میں بے ساختہ یہ شعر بھی ہو گئے۔

بقیہ: ضمیر جعفری مافی الضمیر کے آئینے میں

کے ہاں قہقہے کا ایک دو لکھن شعلہ نہیں ہے جس کی ٹانگیں میں ایسا پتنگاری پھینکا ہے جو دیر تک جلتی اور مٹاتی رہتی ہے۔ اشعار میں نعرہ و شعریات ہے اور غزل اشعار کی طرح کہانی معنویت ہے۔ جناب ضمیر جعفری صاحب کے طنز و مزاح پہ ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ان کی عظمت کے قائل ہوتے جائیں گے اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کے منفرد مقام کا یقین ہو گا۔



بقیہ: بیاد سید ضمیر جعفری

اپنے تاثر اور حسن کے لحاظ سے اصل سے کہیں زیادہ کر ہے۔ سید ضمیر جعفری نے پاکستانی ادب کو کتنا قیام و برکت کر دیا ہے۔ اس کے واسطے کہ بیٹوں شاداب اور قزوین کا رہنے والے تھے۔ انکار رنگ پھولوں سے بھر دیا ہے۔ اس کا احاطہ اور چاکریہ تو اب اہل نقد و نظر کو ایک قرض ہے۔ بھلائی سید ضمیر جعفری۔

ہر نظر بس اپنی اپنی دو فنی تک جا سکتی
ہر کسی نے اپنے اپنے طرف تک پایا مجھے



سید ضمیر جعفری (بایکٹر سٹر میں)

ضمیر جعفری ایک تہ جانتے
بار بار کھل گیا نہ مٹا ہوا رشت
خود شکست کے دو ایوانی
”خمر و میر“ میں بھیکا ہے انگشت
اس مری حیرت والی آہستہ
پھر کہاں ایسے مچھوٹے نشست

یہ جس شوکت کا ذکر شعر میں آیا ہے جو ہر میر کا ایک ”بالکا“ ہے، جیسا شیخو، میرزا غالب کا تھا، یہ نوجوان بہت سنے بچے کی نہایت طر مدار غزل کہہ رہا ہے۔ ”خمر و قصہ خوالی“ کے ”نور خوں“ میں یاسین مراد آبادی، اشرف مہاں، تویر شاہ، حمید مہساس، ذاکر شفیق، واصف حسین، واصف، (پکھرائی شاعر) گریش داس، روشن عزیز، راشد مراد، ہر کسی کا تذکرہ کرنے کو بی چاہتا تھا کہ ہر ایک اپنے اپنے رنگ کا، معنی اور فنی، مجھ و بے نور ملک ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے نہیں کر رہا۔ ”خمر و قصہ خوالی“ کے حوالے سے یہ کہنے کے نہیں تو یہ کہ سے اور اصل پشاور ہی نہیں نکلے دیتا۔ جو ہر میر کی محبت بھی پختا ہوا ہوا ہے اور میرزائی بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں ایک عام آدمی کو مار رہی ہیں۔ جو ہر میر جتنا باکمال شاعر ہے اتنا ہی ”ذائقہ طراز“ پلار بھی ہے۔ ان کی دیہاتی دیہاتوں کے قبیلے کی ”رانی“ ہے۔ پھر پختا ہوا کی طرح وہ آواز نہ دے کر خوش نہیں ہوتے جتنا وہ سر دے کر کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ عیدارک میں (جس کوئی چیز نہیں ملتی) مجھے جو ہر میر مل گئے، ہم ان کے ”ہام آغا“ تو جیسے مگر ادب میں ان کے کام اور زندگی میں ان کے ”انٹ“ سے پوری طرح آشنا تھا۔ کیونکہ ہم ”نکھیل“ میں رہے اور وہ ”چیل“ میں رہے۔ اتفاق یہ ہے کہ وطن عزیز میں کچھ جمہوری آزادی کیلئے جتنی مصروفیتیں اس شخص نے اٹھائی ہیں، ہمارے سنی نامی گرامی انقلابی جو اقتدار کی کرسیوں اور اس کی لوٹ اور لذت سے بھی بہرہ ور ہوئے، کچھ کی ایسی طویل اور کٹھن رات کے عاشق سے بھی نہیں گزرے۔ شاعروں میں ہم ”مہر و حسنہ راسخ“ کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک ہر سچا ادیب و شاعر فطرتاً ”ترقی پسند“ ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”حریت فکر“ کے حوالے سے اردو کی عصری شاعری میں جو ہر میر کی آواز ان چند آوازوں میں شامل ایک جدا گانہ آہنگ کی آواز ہے جو اپنی طاقت و تاثیر سے ایک نئی زندگی کے ستاروں کی راہیں مقرر کر رہی ہے۔ چند روز پہلے عیدارک کے ”صفت ادیب و حق“ کی ایک نشست میں ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا، عیدارک میں آزادی کے دو بگسے ہیں، ایک وہ وحالت کا مجسمہ جو ہاتھ میں ”میشنل آزادی“ بلند کئے سمندر کھارے گھڑا ہے اور ساری دنیا اس کو Statue of Liberty کے نام سے جانتی ہے۔ ایک وہ جو سانس لیتا زندہ Statue of Liberty ہے جس کا نام جو ہر میر ہے مگر جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ خط بہت طویل ہو گیا، مجھے اپنی فرصت میں آپ کی مصروفیت کا خیال تھا، مگر آغا جان جمل انسان بھی تو شعر آرزو ہوتے ہیں اور جو ہر میر بھی ایک ایسا شاعر ہے۔

والسلام
آپ کا ایسا
سید ضمیر جعفری
عیدارک۔ یکم جنوری ۱۹۹۷ء



WHITE WINGS

CONSULTING & TRAINING INC.

ORACLE DBA

- * Oracle Architecture
- * Oracle RDBMS
- * Backup & Recovery

MS OFFICE 2000

- * Introduction to Com.
- * DOS 7 Win 98/2000
- * Word, Excel, P-Point

Windows NT/MCSE

- * Windows NT 4.0
- * Windows NT Server
- * TCP / IP

Quality Assurance

- * Win Runner
- * Load Runner
- * SQA Robot

SERVER PROG.

- * Oracle 8.0
- * Developer 2000
- * Visual Basic 6.0

INTERNET / WEB

- * C + + Programming
- * VB Script, ASP
- * Java Programming

(NO PRIOR KNOWLEDGE REQUIRED)

(100 % ASSISTANCE IN JOB PLACEMENT)

41-44 MAIN STREET, FLUSHING NY 11355

TEL: (718) 359-1222 FAX: (718) 359-3223

Website: www.computraining.net Email: k.tahir@worldnet.att.net

مضامین

چیستان اور پسیلوں کی شاعری (ایک تحقیقی جائزہ)

شباب کاظمی ایم اے (اردو ادب)

چیستان، پسیلیاں اور نخل تیں ہم سب کیلئے اگرچہ کوئی نئی چیز نہیں مگر ذہن نظر اور لائق میں اس پر شاعری کے حوالے سے ذرا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ لیلیوں کی طرح پسیلیاں اور نخل تیں ہمیشہ سے ہر عمر کے افراد کیلئے ایک گوند دلچسپی اور دلکشی کا باعث رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ پسیلیاں ایک خیال کے تحت لڑکے بالوں کیلئے حائل رہا ہوتی، ذہنی جہاز اور پرورش و پرداخت کیلئے اسلاف نے برائے ذہنی و فاضل اختراع کیں۔ انہیں اس بات سے خاصا اتفاق ہے مگر اس اشتیاق کے ساتھ کہ یہ لڑکے بالوں کیلئے اختراع کی گئیں، ہم کلی طور سے متفق نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جیسا آپ آئندہ اور اق میں خود ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ پسیلیاں بڑے بڑے اعلیٰ و مافوق کیلئے بھی ذہنی ورزش کا کام دیتی رہی ہیں۔ بچوں کیلئے یہ ممکن ہے کہ ان کا کردار مزید زیادہ اہم رہا ہو، نفسیاتی طور پر بچے قہقہے، سریت کی طرف مومار و چار چوڑ نہیں ہونے چاہئے۔ خصوصاً اس وقت جو ان کے کھیل کود کا وقت ہو۔ ان دنوں میں یہ تصور سدا اقد نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا، کہتے ہیں کسی دیکھ کاچہ پڑھنے لکھنے کی طرف مائل نہ ہو گا تھا۔ سکول کے استاد کی ناکافی سے جھگڑا کر اس دیکھ نے ایک ماہ نفسیات معلم سے رجوع کیا۔ معلم نے ساری روایات سن کر یہ جواب دیا کہ اس بچے کو روبرو است پر لے آئیں گے۔ ماحول ہونے کے بعد وہ ایک دن تو معلم نے بچے کو صرف اپنے آپ سے مانوس اور اس کی عادات و اطوار، پسند و ناپسند معلوم کرنے میں صرف کئے، اس دوران معلم نے محسوس کیا کہ بچہ نالیوں کی طرف خصوصاً رغبت رکھتا ہے، گویا نالیوں سے ہی کمزوری ہیں، اگلے دن جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے جیب سے پستہ سی نالی نکالی کر میز پر ڈھیر کر دیں۔ چہ بہت خوش ہوا، معلم نے بچے کو ایک نالی دے کر پوچھا ہم نے تمہیں کتنی نالیاں دیں؟ بچے نے کہا تین۔ استاد صاحب جو سوچ رہے تھے کہ بچہ شاید اگر پر کر رہا ہے، تین اور نالیاں دے کر کہے یہ کتاب تمہارے پاس کتنی نالیاں ہو گئیں، بچے نے اٹھویں پر گئی کر تیار، کل چھ نالیاں ہو گئیں۔ پھر نالی ایک اس نے سب نالیاں گھسے سے زمین پر دے، ماریں اور کہنے لگا ”جناں میں ہے، قوف نہیں ہوں، آپ مجھے حساب سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

یہ سارا حال تو یقیناً ظاہر بھی ہے اور کسی حد تک قابل فہم بھی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بچوں کی تعمیر، تربیت اور ذہنی ارتقاء کیلئے ان دنیا بھر کی حکومتوں نے پوری پوری مشینری تعمیرات کی ہوئی ہے جو انہوں کو ذہن کی لامنت سے ایسی کتابیں، کتابتیں، کھلونے اور دیگر دلچسپی کے سامان چار کر لے میں لگی ہوئی ہے، جن سے بچوں میں سیکھنے، سمجھنے کا جذبہ ابھار دیا۔ آج اس قوی یافتہ دور سے بہت پہلے بھی لوگ جیسا اس ضرورت سے واقف تھے مگر ان کے وسائل مختلف، محدود اور سوچی سمجھا ہوا تھے۔ وقت کے کارآمد مسخرے کیلئے شاید

پسیلیوں سے کام لیا گیا ہو گا، ایسے بچے تو نہیں جیسا کہ اس قصہ میں بیان کیا گیا ہے مگر وہ بچے جو اپنی ذہانت کی اہمیت سے واقف تھے انہوں نے پسیلیوں کی طرف خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ بچوں اور بڑوں میں فرق یہ تھا کہ بچوں کی پسیلیاں اور سوالوں کے معیار مختلف تھے۔ پسیلیوں اور نخل توں کے محل کرنے پر تحسین و آفرین، بزرگوں کی خصوصی توجہ کا حصول، مراعات، نقد اور جیب خرچ میں اضافہ، کھلونوں، اشیاء کے مطالبات کے حصول میں مدد و معاون ہونا، سب ہمارے آپ کے مشاہدے کی باتیں ہیں۔ بچوں کے علاوہ لڑکے بالوں اور نوجوانوں کے پندال میں بھی پسیلیاں اور نخل تیں خاصی مقبول رہی ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسالہ قات کسی نہ کسی طرح یہ ان کے دماغ میں بھی خاصی اثر انگیز ہوتی تھیں۔

ہماری کتابتیں ایسے بچے سے قصوں سے بھری پڑی ہیں جن میں ہمت مردانہ اور ذہانت کی آزمائش پر بہت سے معاصرین میں علی الخصوص اعلیٰ مرتبوں کی خواتین کی شادیاں کی جاتی رہی ہیں۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں شہر شادی اور حسن بانو کے سات سوالات حیدر خوش حیدر کی آزمائش محفل میں تو ہم سب نے پڑھے ہی ہوں گے۔ اگرچہ یہ واقعہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں مگر سماجی افکار اور روایات کا چہ ضرور رہا ہے۔

پسیلیوں کے ضمن میں دستور ہے کہ جب جواب نہ ملے تو ہار مان کر پچھنے والے سے پوچھ لیا جائے۔ ہار ماننا بہت سے لوگوں کی ان کا بھروسہ کر رہا ہے۔ اس لئے جو ہار دینے کیلئے تیار نہ ہوں اس کا جذبہ تجسس اسے سچی و چود چود پر اکساتا ہے اور یہ اشتعال اسے قریح علم کے دروازے تک لے آتا ہے۔

تاریخ ادب کے لوراق بتاتے ہیں کہ شاعری کے رواج سے پہلے پسیلیاں خالی ستر میں ہوتیں جن کا ستر ایک جگہ سے دوسری جگہ ذرا مشکل اور مشتبہ ہو جاتا اس لئے کہ ستر کا پار کھنا شعر کے پار دیکھنے کے مقابلہ ذرا مشکل کام ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو بڑوں کی نہیں تو بچوں کی انفرادی ذہانت پر جب کہ ان لوگوں کو بڑی مہم ہوئی ستر نقل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعری کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ پسیلیوں کے بازار کیلئے شعراء نے پسیلیوں کو شعری لباس عطا کیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ستری پسیلیاں بھی ستر پہ رہی ہیں مگر جو شعر سے اور توجہ شعری پسیلیوں نے حاصل کی وہ ستری پسیلیوں کو اقصیٰ نہ ہو سکی۔ (جو احباب یہ مضمون پڑھ رہے ہیں وہ اگر اپنی یادداشت کو گریہ میں تو ان کو جو پسیلیاں یاد ہیں ان میں سے بعض شعری پسیلیاں ہوں گی)

مگر اور جن شعراء نے پسیلیوں میں سب استطاعت شعری صنعتوں کو داخل کیا جن کا ذکر آگے آئے گا۔ حسن بانو کے سوالات کے رد گھس پسیلیوں میں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ بچے والے کو بولی کی عبارت کے اندر ایسے دھڑکے فراہم کر دیتے جائیں جن کے ہمارے اس کا ذہن علی کی طرف متوجہ ہو سکے، جسم اشاروں اور جھلک بولی کی صورت

میں ہوتے والے کو بھاننے والے سے اتنا پتہ یعنی Clue پونے کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً جس چیز کے بارے میں پوچھا گیا ہے آیا وہ کھانے میں ہے کہ پینے میں، علیٰ ذہن القیاس، کسویٰ کے فیہ کی پروگرام میں تو جس سوالوں کی حد کا تعین ہم سب کو یاد ہو گا، مگر پسیلیوں میں ایک سے زیادہ سوال کی گنجائش نہیں مانی گئی۔ اگر جو بھانھانے والا بتائے کہ یہ چیز کھانے میں آتی ہے تو بھانھانے والے کیلئے آسان ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے پہلی میں موجود اشاروں کی مدد سے صرف کھانے والی اشیاء کی تلاش کرے جو پہلی کا جواب ہو۔ پسیلیاں اور جملہ تفسیریں اپنے دلوں سے صرف پسیلیوں پر اکتفا نہیں کیا، پسیلیوں کے اھ "تکریباں" یا "تکریباں" نکلیں، جیسا کہ ہم سے ہی ظاہر ہے کہ اس قسم کی پہلی میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ پہلی کی مہارت میں پہلی کا مل بھی پوشیدہ ہو، کہ تکریباں میں بھانھانے والے کو کسی سوال کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ علیٰ ذہن القیاس، اگر کوئی کوئی نام کی تکریباں پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایسی پسیلیاں نکلیں جن کو "دوسرے" کا نام دیا گیا۔ نام کی رعایت سے دو نسخوں میں یہ اہتمام ہوتا ہے کہ سوال یا پسیلیاں تو دو (الگ الگ) ہوتی ہیں مگر دونوں کا جواب ایک ہوتا ہے جس کی مثالیں آگے پیش کی جائیں گی۔

پسیلیاں اگر جو اسب کو جانت نہ کرتی ہوں تو دو پسیلیوں کے زمرے سے خارج تصور کی جاتی ہیں (یہ ذکر بھی اپنے مقام پر آئے گا) جیسے جیسے شاعری ترقی کرتی گئی پسیلیوں کی زبان صاف سے صاف نہ ہوتی گئی، پسیلیاں اگر بڑی زبان میں Enigma یا Riddle، فارسی میں چیستان، عربی میں معرہ اور ہندی اپنی زبان میں انھیں پہلی یا جملہات کہتے ہیں۔ یہ بات ہم سب کیلئے باعث مسرت ہے کہ اردو کی طبقہ تقریباً سارے نام استعمال کرتا ہے جب کہ دوسری زبانوں نے والے صرف اپنے ہاں کے مروجہ نام ہی تک محدود رہتے ہیں۔ پسیلیاں لکھنے والے لوگ اس قدر زیرک اور قوی مشاہدے کے حامل افراد ہوتے ہیں کہ اکثر بھانھانے والا فراموشی کی موجودگی کے باوجود مفصلے میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلی کا جواب اس قدر واضح و درست اور شفاف ہوتا ہے کہ بھانھانے والا جواب سے مکمل طور پر مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس تفصیلی تمہید کے بعد اب آئیے ہم آپ کو اس شعری چیستان کی سیر گزراتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک نثری پہلی بھانھانے ہیں۔

پہلی میں گئی تھی لینے، دور سے لگی، اگر وہ نہ دیتی تو میں لے آتی۔
 لعل اس کے کہ ہم اس پہلی پر نگہ کر رہیں شاعری کی ایک صنعت جسے "صنعت ایہام" کے نام سے جانا جاتا ہے کی تعریف کرتے چلتے ہیں جو آگے چل کر قارئین کیلئے لطف مضمون کو زیادہ لطیف بنانے میں مدد دے گا، شعر کی زبان میں "صنعت ایہام" اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے شعر میں ایسے الفاظ یا فقرہ استعمال کرتا ہے جس کے ایک سے زیادہ مضمون ہوں اور شعر میں دو سامنے کے معنی کی بجائے یعنی حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنی لے رہا ہو اور ہم آپ کو مغالطہ اور باہر، شاید یہ بات اس مثال سے صاف ہو جائے۔

مر جائے ایک دم میں لو تھوک کر رقیب
 منہ میں ہمارے منہ سے جو اک بار پان لے

ایہام کے بارے میں دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر گویا قاری کے ذہن کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے اس کے جذبہ تجسس کو اٹھارتا ہے کہ وہ شعر پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ ظاہر شعر جو معنی دے رہا ہے وہ شعر کے اعتبار سے ٹھیک نہیں معلوم دیتے۔ نتیجتاً دو لفظوں کے مطلوب معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس

صنعت میں ظاہری معنی جس قدر مغالطہ خیز ہوں گے یہ صنعت اسی قدر کامیاب قرار پائے گی۔ اب آئیے شعر کی طرف توجہ "منہ میں ہمارے منہ سے" کے الفاظ ہندل نظر آتے ہیں اور قاری کا ذہن فوری طور پر اسی (ہندل معنوں) کی طرف جاتا ہے مگر فوراً کریں تو ہم یہ کہتا ہے کہ "ہمارے منہ سے" کے ایک اور معنی بھی ہیں، جو شاعر کہہ رہا ہے وہ ہے، ہماری خاطر سے، ہمارے لفظ سے، ہمارا دل دھکے کیلئے، اور اب آپ دیکھیں کہ پہلی اختراع کرنے والے نے نثر میں بھی صنعت استعمال کی ہے، ذہن کو پوری طرح الجھایا گیا ہے، اگر کوئی کسی سے کوئی چیز مانگے جائے تو مانگنے کا رد عمل "دیٹا" ہے تو پھر "دیتے" ہونے نہ لائے کا کیا معنی ہو ۱۹۲۱ء میں پرنسز ڈوڈا لائے کی بات یہ ہے کہ دینے کی صورت میں نہ لائے کی کوئی توجہ ہو گی۔ کوئی ایسی چیز ہو گی جو دینے کی صورت میں نہ لائی جاسکے پھر نہ دینے کی صورت میں لائی جاسکے، پہلی کا جواب ہے "بھارو"۔

اب ذرا پھر اس پہلی پر غور کیجئے کہ ایک صورت پڑوسن سے بھارو مانگنے لگی ہے، دیکھا پڑوسن خود بھارو دے رہی ہے، اس لئے یہ لانے سے قاصر رہتی ہے۔ سارا تفصیل لفظ "دینے" کا ہے جو بھارو کے استعمال کے ساتھ منسلک ہے اور جسے استعمال کر کے اختراع (پہلی تفصیل دینے والا) نے یہ سدا مغالطہ پیدا کیا ہے۔

پسیلیوں کے ذیل میں عرض یہ ہے کہ جن پسیلیوں کا ذکر ہم اس مضمون میں کریں گے ان میں سے بہت سی آپ سب کی سنی ہوئی ہوں گی۔ اور جو بات بھی آپ سب کو یاد ہوں گے لیکن نہ بھی معلوم ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ ہم یہاں پسیلیاں نہیں بھانھانے رہے ہیں۔ فن پسیلیوں میں سے بہت سی پسیلیاں ہمارے بھانھانے اور لڑکپن کی سنی ہوئی ہیں۔ کچھ کا ذکر ہم نے دوسری کتابوں بشمول "آب حیات" میں پڑھا ہے لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس مضمون کے لکھنے کی تحریک ہمیں ایک غیر معروف انگریزی مضمون Poetry Calander بحر یہ جون 1997ء میں ایک مضمون کو پڑھ کر ہوئی۔ اس مضمون میں ہم نے اس سے خاصی مثالیں نقل کی ہیں جو آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔ ان مثالوں سے معاشرتی اور ماحولیاتی، فکر اور وجدان کا فرق اور ہم آہنگی کے علاوہ پسیلیوں کے شعری ادب کا اندازہ کیا جاسکے گا۔ اس مضمون میں ہم کچھ فارسی پسیلیاں بھی پیش کریں گے مگر انہیں ہمیں اس کا ہے کہ کوشش کے باوجود ہم عربی زبان کی کوئی پہلی نقل نہیں کر سکے۔ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ ہم نے لیویا میں اپنے سارے چار سالہ قیام کے دوران کبھی کوئی پہلی نہیں سنی اگرچہ ہم تو جو انوی کو پڑھانے کے کام پر مامور ہونے کی وجہ سے اسکول کے ماحول میں تھے۔ یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں کہ عربی ادب میں پسیلیاں وجود نہیں رکھتیں مگر اس کا ایک صاف مطلب جو ہماری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان جس کے الفاظ ایک بڑی تعداد میں ہماری اردو زبان کا جز ہیں، لے ہماری ثقافت اور زبان پر اس ضمن میں کوئی قطع نہیں چھوڑا، اس کے جزاء کے طور پر شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ عربی زبان قرآن کی زبان ہونے کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں شعرا اور عوام کیلئے ایک جبرک حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس سے ہمارے یہاں تقریبی اور نمونہ لعب کے میدان میں غیر شعوری طور پر کام نہیں لیا گیا۔ یا لیا جانا مناسب خیال کیا گیا ہو۔

صنعت ایہام کی اقسام کا مقالہ شعراء ایک اور صنعت جسے "صنعت تعلیل" کہتے ہیں شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ اس صنعت میں معنوی اور لفظی مغالطہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ وجہ اور سبب سے یہ کام لیا جاتا ہے مثلاً

پاک ہو تھی سپاہ خدا تین دست کی
 ساحل سے ہر چلتی تھیں موہیں قوت کی

میر انیس

اس شعر میں موجوں کے سرچنے کی وجہ سے سپاہ خدا کے قتل و کشتار سے بچات ہوئے کو قرار دیا گیا ہے جبکہ اصل وجہ یہ نہیں بھڑھیولا ہیگل اور طبعیاتی ہے۔ لیکن اصل وجہ کو نہیں پشت اٹال کر ایک نئی وجہ اختراع کی گئی ہے جس سے کام میں لانا جو ذرا دور ٹیکنی پیدا ہو گئی ہے وہ اصل وجہ کے بیان کی صورت میں پیدا ہو سکتی۔ وہ اٹم اس سے شاعر کی فطرت و ذہن اور پرواز تخیل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہم آگے چل کر پہیلی کی نسبت سے اس صنعت کے استعمال پر بھی بحث کریں گے۔

اردو کے محقق اور زبان کے مگر کے عقین پر ابھی تک متفق نہیں ہو سکے ہیں جو ایک نہایت افسوسناک بات ہے۔ جو بہت سے ترمیمات ہیں ان کے خیال میں اس کی عربی تیسری صدی میں داخل ہوئی ہے۔ اس کی توجہ جو میری ترجمہ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان کی پہلی بار فطرت مگر کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی بار کلی کے بعد سے پہلے کی صورت حال اس کے معانی ہے مگر میرا معروضہ اس اڑیٹا میں یہ ہے کہ کم از کم امیر خسرو کے زمانے سے اردو کا آغاز مان لینے میں کوئی معترض نہیں۔ جس کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا جنم نہایت زیادہ طویل قیام پھر اردو ہے سر پرست، کھنڈری اور لالائی ہونے کے سبب بلوغت کی مرحلہ میں دیر سے داخل ہوئی۔ چنانچہ اس کے کہ ہم چارپائی صدیوں تک اردو کے وجود سے ہی انحراف کریں۔ چونکہ اس مضمون میں ہم امیر خسرو کی اردو پسلیوں کا بھی ذکر کریں گے اس لئے یہ بات ضرورتاً فہم میں آجی ہے۔

پسلیوں اور غلط فہمیوں کی افادیت اور تلافی کے پیش نظر شعراء نے اس پر خصوصی توجہ دی حتیٰ کہ سنائی دیدار شاعری کی ترتیب، مذہب کرتے وقت اصناف سخن میں "معنا" بھی شامل کیا گیا۔ کچھ بھی ایک قسم کی پہیلی ہی ہے۔ صنعت ایساں اور حسن قیاس پر اگر غور کیا جائے تب اس کا جھٹکا بھی لگایا تو یہ پسلیوں سے چھائی و بظ نظر آتا ہے۔ چونکہ کوئی میں بھی پسلیوں کا نظر آتا ہے۔ یہ نہ کہ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر گیا جائے گا۔ پسلیاں اور غلط فہمی زبان کی مدد و ترقی کا پتہ دیتی ہیں کہ کس زمانے میں کس قسم کے اور کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب نہیں ہیں یا منجھ کر ان کی شکل کیا ہو گئی ہے۔ معاشروں اور غلط فہمیوں کا بھی پسلیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پسلیوں کی معنوی درستہ اگر غور کیا جائے تو یہ کتنا لفظ اور کاکہ عبادت کے ذریعے تخلیق کار اور اصل ایک فریب Illusion پیدا کرتا ہے۔ چونکہ پسلیاں غلطیوں اور زبان سے متعلق ہوتی ہیں اس لئے یہ Illusion فریب ذہنی ہوتا ہے۔ طبعی نظر انسانی نے اس ذہنی فریب پر انتہا نہیں کیا بلکہ طبعی زندگی میں Optical Illusion بھی تخلیق کئے گئے تھے فریب نظری کہا جاتا ہے۔ کراہی کے چر یا گھر میں دو عورتیں ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے قہر میں کوئی ہو گی جس کا بدن لومڑی کا اور سر انسان کا ہے اور وہ لومڑی انسان کی طرح باتیں کرتی ہے۔ یہ Optical Illusion کی ایک مثال ہے۔ ورنہ ایسا کوئی جانور نہ ہو جس کا کتا، تم آج کوٹا کھتے ہیں کہ یہ مٹھن آئینوں کا مال سے اور کاکہ نہیں۔ عمارت کے کرب اور تاح کی معانی بھی اس فریب نظری کی صورت میں آتے ہیں۔ مشہور زمانہ ہر ذہنی کا نام اس فریب نظری کی بدولت زندہ ہے۔ اسے قمار ہے۔ ہم سب اپنے طبعی انعم اور چوں اپنے طبعی انعم و انجمن کا پامٹ ہوتے ہیں۔ تجس اور خیر انسان کو نظر نہ آتا کہ ایک اور مسرت مہیا کرتا ہے اور یہ کیف کا سامان اختراع کرتے والے لے صاحب اور الگ اور ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ اس تحکم کا بعد سے مضمون سے صرف اتنا تعلق ہے کہ بہ ان اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس سے پسلیاں طبعی نہیں ہوتیں۔ یہ کہ فریب کے ذہن انسانی اور طبیعت پر قوت سے مشتمل ہوتی ہے۔ عموماً دھوکا دے کر اور دھوکا کھانے کوئی خوش نہیں ہو سکتا۔ یہ کیف ہوتی ہے مگر یہ ذہنی دھوکا

ہم ہر وقت خوش خوشی کھانے کیلئے نہ صرف چارہ جے ہیں بلکہ وہ بھی دیتے ہیں، اگر ہم اپنی ذہنی صلاحیت کے زور پر بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں تو ایک گونہ مسرت اور تلافی حاصل ہو تا ہے جو ذہنی انعام کے علاوہ ہے۔ شاعری کی تعریف میں ارکان قضاء و قدر اور ارباب حل و عقد نے ایک تعریف میں حصول لذت، کیف اور مسرت کی بات بھی کی ہے بلکہ اس نے اسے اہم ترین جز قرار دیا ہے۔ شعراء نے زندگی کو بھی "معنا" کہا ہے، ایک معنی ہے کھنے کا نہ سمجھانے کا۔ زندگی کا ہے کوئی خواب ہے روح انے کا۔ شاید اسی لئے کہ ہر آنے والا اور ہمارے لئے انجمنی، عادیہ و دور غیر متوقع واقعات سے کر نمودار ہو تا ہے جن کا حل ہم پہلے سے نہیں جانتے، ہماری زندگی میں جو کشش رہ جائے گی، (یہ ایک لمحہ فکر پر ہے) جنسیات کے ماہرین نے بھی زندگی میں دریافت اور تجسس کو بہت اہم قرار دیا ہے۔ گو اس دریافت اور تجسس کا معیار معاشرہ اور معاشرہ مختلف ہے جس پر ہمیں مختلف نہیں کرنا۔

یہاں سے ہم اس مضمون کو زیادہ وسیع اور موقر بنانے کیلئے ذرا مگر سے مطالعہ کی طرف آتے ہیں تاکہ ہماری شکوہ ہماری ذہنی انعام سے تیار کر دے ہوئی قلمند معنوم دے درجہ ڈولبر جو ایک پلور انعام یافتہ مترجم اور شاعر ہے اپنے اسی مضمون میں جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ پسلیوں کے بارے میں یہ قہر آتا ہے کہ اولین پسلیاں قدیم باہل کے طالب طبعوں کے Tablets یعنی پڑھنے کی سیزوں پر پائی گئی ہیں۔ پسلیوں کے بارے میں افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں خاصہ سر پرستانہ اور ہندوستانہ رویہ اختیار کیا ہے جب کہ یہ خلاف اس کے شاعری کو سخت ست کہا ہے۔ دوسری طرف اس سطورے جو اپنے شعری نظریات کے تحت پسلیوں کو عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پسلیوں کی شاعری وہ شاعری ہے جس میں حقائق غیر معمولی اور امکانات کی حد تک سلجھنے والے قانون باتوں میں فن دی جاتی ہے جو ایک ذہنی کمال ہے۔ اس کی رائے میں یہ اعلیٰ معیار اور بہترین باتوں کی شاعری ہے۔ وہ ان کو گراں قدر کہنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ان کی تخلیق میں اعلیٰ ترین استعداد اور تشبیہات Metaphors سے کام لیا جاتا ہے۔ جو بولی اسطوہ شاعرانہ صلاحیتیں ہیں جو نہ تو بڑھائی جاسکتی ہیں نہ سکھائی جاسکتی ہیں۔ ہمارے یہاں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ صلاحیتیں وہی ہیں کسی نہیں اور مزید کہتا ہے کہ میر جی استعداد Metaphors اعلیٰ ترین ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جس میں وہ اپنی عبقریت اور اور اک سے کچھ مشابہ و مماثل چیزوں کا رشتہ کچھ دوسری غیر مشابہ چیزوں سے جوڑ دیتا ہے۔ جو تھی پانچویں صدی مسوی میں ایک شخص سملو فیض Symphocius نے تین تین مغزوں کی ایک سو پسلیاں لکھی ہیں، یہ ساری پسلیاں Folk Tradition اور رسوم کی غلام ہیں اور ان کا تعلق روزمرہ کے معمول اور استعمال میں آنے والی اشیاء اور ممالک سے ہے۔ یہی شخص بلکہ اس نے ان پسلیوں کو عمدہ شعری روایات سے بھی مزین کیا ہے۔ ہم یہاں اس کی ایک پہیلی نقل کرتے ہیں جو ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔

Four equal sisters equidistant run. As if they vied in strength and speed, but None Gains on another and their task is done.

اس پہیلی کا جواب پہلے Wheels ہے۔ یہاں ہم اگر اسطر کے نظریات کے تحت دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ چار بھائی اور استعداد Metaphors کیسے اس پہیلی میں داخل ہیں، گاڑی کے چار پہیوں کو چار چڑیاں کہیں کہیں گاڑی کا سر دوز کرے گا اور پھر یہ کہنا کہ کوئی ایک دوسرے سے باڑی نہیں لے جاسکتا اور یہ کہ کام بھی ختم ہو گیا یہ جیسا کہ معمولی

ذہن کے لیے بات نہیں۔ یہ کمال تفکری استعداد ہے۔ استعاروں کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ اشیاء کن باتوں میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور کن باتوں میں نہیں۔ یعنی ہم اگر معمولی سا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کسی کی آنکھ کو ستارے سے تشبیہ میں تو اس سے مراد ستارے کی چمک ہو گی نہ کہ ستارہ جہاں خود ہو گیس ملتی ہو پھر اس پر مشتمل ہے یا ہم اسی آنکھ کو کتاب کی آنکھ سے ملائیں تو اس کا مطلب نظر کی چیزی ہو گی نہ کہ وہ گول گول جہ صورت آنکھیں اور ڈالنے والا یہ نمونہ۔

اسلامی کتاب Rehtoric (مکالمہ) میں اچھے اور خیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ استعارہ کسی زبان میں قاری یا سامع کی سطحی توقعات کو خیرت اور فربہ میں ڈال کر ہوش پاتا ہے، اس کو ہم مزید بول واضح کر سکتے ہیں کہ ایک پڑھنے والا جو دراصل کسی سادہ سی بات کا موقعہ اور توجہ میں اس کے نہ نکس بات کہ دی جاتی ہے تو قاری یا سامع اس بات سے نہ صرف خوش ہوتا ہے بلکہ اس بات سے کہ اس نے کوئی نئی بات جان لی ہے۔ اس کا جذبہ حصول علم تسکین بھی پاتا ہے۔ آگے بڑھ کر وہ کہتا ہے کہ پہلی بھی اسی وجہ سے ہم کو جملہ، مسرت اور شادمانی فراہم کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح شاعری خیر انگیز اور توقعہ اور توجہ سے بھنی ہوئی فکر سے سمجھ میں آتی ہے تو خیر یہ کہتا بھی دوسرے وہ کاک کہ پہلی اور اس دلیل میں مبالغہ کی حد تک محیط ہے، شاعری کا ایک جزو لازمی ہے، اگر استعارہ و تشبیہ یعنی مماثلت کا تصور شاعری میں مرکزیت رکھتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہیلیاں اس مرکز سے قریب تر ہوتی ہیں، جس طرح ہم شاعری میں مماثلت پر توجہ دیتے ہیں اسی طرح یہ مماثلت ہم کو ہسیلیوں میں بھی نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔

پہیلی کے بارے میں مختلف طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کی جڑاویت حد تک استعاروں اور مجاز Mataphor پر ہے۔ حقیقتہً مماثلات کا غیر متعلقہ غیر مماثل سے رشتہ جوڑ دینا تفریع کے لئے ایک ذہنی ایجن اور قوت عمل کی رفعت کا پتہ دیتا ہے۔ ہم پہیلی کو سمجھنے کیلئے ذہن میں معلوم چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں وقت اس کا وجود اشیاء کی جگہ جگہ اروں میں مٹا ہے یا انکس ہم جانداروں میں ذکر ضرور ہے ہوتے ہیں اور وہ اشیاء میں مٹا ہے۔ اس کا دور دورہ دیکھنے والے کی سرشت ذہن اور تجزیہ کاری کی صلاحیتوں پر ہے کہ وہ کتنی ذہانت سے غیر متعلق اشیاء کا متعلق اشیاء سے رہا کا دور آگ کر لیتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ پہیلیاں کچھ جتنا ذہن افن ہے۔ پہیلیاں جتنا اس سے بہت کم تر نہیں، اس لئے کہ ہمارے نزدیک وہ اصل پہیلی ہوتے وقت دیکھنے والا اپنی راہ پر معکوس سفر کر کے ہی پہیلی کو سمجھ سکتا ہے۔

ہسیلیوں کے بارے میں مائیکل الیکزندر Michael Alexander اپنی تصنیف Er-tier English Poems میں لکھتا ہے کہ پہیلیاں غیر معلوم دنیاے فطرت کی حقائق کا نام ہے۔ یہ یادداشت کو پرکھنے، سالن پر چڑھانے کے علاوہ ہمارے Sense of Humor جس لطیفہ کو اپنا کر کے ہماری معلومات کے ذخائر کو کٹک پہنچاتی ہے، یہی نہیں جس پہیلیاں ہم کو آئے دن پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو ذہنی طور پر قبول کرنے میں بھی مدد فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً اظہر "پہ" کے پڑنے کا وجود دہانتے کیلئے ویسے تو تیار نہیں ہوتے مگر ہم شاعری اور پہیلی میں دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اس قسم کی خیر احوال تبدیلیاں جو آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں ہم انہیں غیر شعوری طور سے اپنے پیشانی ادب کی تربیت کے تحت قبول کر لیتے ہیں۔ پہیلیاں ہماری Vocabulary Hary خانہ الفاظ کی وسعت میں بھی مددگار ہوتی ہیں۔ وہ اس لئے کہ ہسیلیوں کی مبالغہ و تلوذ معنی الفاظ پر رکھی جاتی ہے۔ یا پھر ان میں انداز کے تقابلی کا مہرب شامل ہوتا ہے یا مجاز اور استعاروں کا کشتہ، ان صورتوں میں ہم شاعری کی معروف صنعتوں یعنی صنعت

ایہام، صنعت طباق، صنعت تشاد، حسن تعلیل، مجاز مرسل، مماثلت، استعارہ، تشبیہ، حیرت سب کی سہ سی میں آجاتے ہیں، اچھی صنعتوں کی موجودگی کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ انکار کرتے ہیں کہ پہیلیاں شعر گوئی میں اعلیٰ مقام نہیں رکھتی۔

اس مصروف ترین دور میں کچھ لوگ اس خیال کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ اولاً پہیلیاں کوئی انکار وقت چیز ہو گئی ہیں دوسرے یہ کہ پہیلیاں محض ایک Trick Question یا مغالطہ خیر سوال ہے کہ جو حل ہو جانے پر اپنی غلطیت خود بخود زائل کر دیتا ہے اور فنا میں مزید رکھتی باقی نہیں رہتی۔ ہمیں یہ خیال اور استدلال بھی طور پر درست نہیں معلوم رہتا مگر کسی حد تک ہم یہ بات بخیر ہسیلیوں کے متعلق مان بھی سکتے ہیں۔ شاعری کبھی انکار رفتہ چیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ اپنی دلچسپی زائل کرتی ہے۔ شعری پہیلیاں فرصت کا کھیل ہونے کے باوجود نہ صرف شعری خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں بلکہ ان کا ہمارے شعری سرمایہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہ کن بھی ہمارے ذہن میں اپنے مضبوط پچے گاڑے ہوئے ہیں اور کن بھی ہم اگر کوئی انہیں پہیلی سمجھتے ہیں تو محظوظ ہونے لگتے ہیں۔

پہیلی تخلیق کرنا اور سمجھنا دونوں انسان کی ذہنی صلاحیتوں کی قوت ہیں۔ پہیلی اختراع کرنے والا کسی چیز کے بارے میں اس کا نام لئے بغیر پوچھتا ہے جس کیلئے وہ حوالے اشارے ترتیب دیتا ہے۔ یہ اشارے فرضی ہونے کے باوجود سب کے سب کسی حقیقی چیز سے ملتا رہتے ہیں۔ یہ مفروضہ اشارے ہمارے ذہن کو کسی بھول بھلیاں میں ڈال کر گمراہ بھی کرتے ہیں جس کے باعث ہم فوری طور سے اس کے حل تک نہیں پہنچتے۔ ہسیلیوں میں ہماری ذہنی رو کو ہلکانے کیلئے ایسے تشادات کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جن سے خواہ وہ بات بالکل سائنس کی ہی کیوں نہ ہو ہمیں گھٹک نظر آتی ہے۔ پہیلیاں عموماً ہماری روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والی اشیاء اور سامان، غیرت سے متعلق ہوتی ہیں۔ آئیے ذرا اس دو مصرعوں یا لائنوں والی پہیلی پر نظر ڈالیں۔

I tremble at each breath of air, and yet can heaviest burden bear

یہ بات درست ہے کہ مختلف زبان مختلف انداز سے سوچتے ہیں، ہم یہ بات اوپر کہہ چکے ہیں کہ پہیلی دیکھنے والا کہنے والے کی طرح انتہائی سطحی النظر، ذکاوت ذہنی Intuitive اور تجزیہ کار ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اس پہیلی کو دیکھنے والے اس میں مبینہ تضاد پر غور کیلئے ایک ایسی ہڈک یا کمزور چیز ہے جو ہوا کے معمولی جھونکے سے لرز جاتی ہے جبکہ دوسری سطر میں وہی چیز اتنی قوی بھی ہے کہ ہماری سے ہماری وہ جو اٹھانے کا عمل رکھتی ہے۔ نزاکت یا کمزوری کے حوالے سے ہم جائزہ لیں تو ہمارا ذہن مثلاً پہ بال و دھڑاں کا غدار ہے، بکری کا جالا، بھوسہ، پردے وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے مگر یہ چیزیں وہ جو اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لئے ان کے ساتھ ہی ساتھ ہم ان چیزوں کا بھی تجزیہ کرتے ہیں جو ہوا جو اٹھانے کی منتقل ہو سکیں، یہ توں اور توں کو ہی بھی ہو سکتا ہے، پہلی وہ جو اٹھانے والے جانور، پھلوں سے لے کر ہونے اور ان میں گئے ہوئے ٹوک پتے بھی ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں لیکن ان سب میں کوئی چیز قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ ہمیں کسی ایسی چیز کی تلاش ہے جو دونوں اشاروں پر چری اترتی ہو۔ اچانک ہمارے ذہن میں ایک روشنی سے نمودار ہوتی ہے اور ہم پہیلی کے حل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ چیز "پانی" ہے۔ اور اب جو تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "پانی" کے علاوہ اس کا کوئی حل تو ہی نہیں ہو سکتا، پانی جو ذرا سے ہوا کے ٹپھر سے لرز جاتا ہے وہی اپنے سینے پر ہماری ہر کم جہاز اور کشتیاں اٹھا کر چل سکتا ہے۔

مجاز اور تشبیہ کہ ہسیلیوں کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے

کہ لوہا تو اس کے تخلیق کاروں میں نہ تھا بلکہ انہوں نے Leonard Galileo Galilei، Servantes، کی ویلیاں Rebelais، یاٹس Wylt، شیکسپیر Shakespear اور گلگ ہر جیسے معتمد بھی ملے ہیں۔ دوئم یورپ کے قور خانوں اور بادوں میں پہیلیاں بھانپنا ایک عام رواج اور مقبول شکل تھا۔ جب کہ بعد ازاں مقبول عام، ساگل میں ان کی اشاعت ایک مقبول تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ Swift کی پہیلیاں ایک خاص درجہ شہرت پر پہنچیں اور بھی شہسب بھو یہ نظریہ ۱۷۰۰ میں طرہ سے تیار کر کے طویل ٹکڑوں کی صورت میں ظہور پذیر ہونے لگے۔ جہاں جہاں Jonathan Swift کی ایک پہیلی جو کارک سکرو Gorck Screw سے منطقی ہے۔ 38 لائنوں کی ہے۔ جبکہ ایک اور پہیلی جو روشنائی INK کے بارے میں ہے۔ سات قطعہات پر مشتمل ہے۔ یہ گویا 28 لائنیں ہو گئیں۔ ٹھری پہیلیاں دلچسپ اور چونکا دینے والی ہونے کے باوجود زیادہ سفر نہیں کر پائیں جس کی مثال میں درج ذیل پہیلی پیش کی جا سکتی ہے۔

What is the difference between a Jeweler and a Jailer?

اس کا جواب ہے:

A Jeweler sells watches and Jailer watches colls.

آپ دیکھیں گے کہ اس میں بھی دو ایسے لفظوں کا تخیل ہے جو غلط سموت کے قریب ہیں۔ مگر معنوی اعتبار سے مختلف۔ یہ وہی صنعت ہے جو ہماری اردو شاعری میں صنعت لہام کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ پہیلی ایک دفعہ سننے کے بعد اتنی چاقوب اور دلکش نہیں رہتی اور اس کی وجہ صرف اور صرف اس کی ٹھری ہونے کی نفاذی ہے اور جائیدادیت ہے وہ اسی شعری صنعت کی وجہ سے ہے۔

جہاں جاتی ہے کہ ہسینوں کا رواج زمانہ قدیم میں ساج اور طاقتی حدود میں کتنا اہم تھا۔ یہاں تک کہ ایک سزا یافتہ قیدی اگر عدالت کے سامنے کوئی ایسی پہیلی پیش کر دے جو وہ حل نہ کر سکیں تو اس قیدی کو رہا کر دیا جاتا تھا۔ اس ذیل میں پہیلی پیش کرنے سے پہلے ہم انجیل مقدس کے حوالے سے ایک پہیلی پیش کرتے ہیں۔ انجیل کا یہ کردار جس سے یہ پہیلی منسوب ہے ہم سب کیلئے ظہور کے حوالے سے بھی معروف ہے۔ یہ پہیلی اپنی شادی کی دعوت کے موقع پر سمسن Samson نے اپنے دشمن فلسطینیوں کے سامنے رکھی تھی۔

Out of the Eator came something to eat out of the strong came something sweet.

تخلی اس کے کہ ہم اس پہیلی پر غور کریں ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ اس پہیلی میں کون سے چیزیں ہیں جو چار سطریں پر لکھی ہیں۔

As I was walking down the lane,
out of the dead he living came,
four there were, and five to be,
now tell me this riddle or set me free.

آپ دیکھیں گے کہ ہر چاروں سطروں پر پہیلیوں میں شعری آہنگ و سحر اور جادو ہے مگر انہیں پر انسانی انداز سے لکھے ہوئے ہیں جن کا حل ممکن نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا تعلق انسانی سے نہیں کسی نیا یا انسانی تجربہ سے ہے بلکہ کوئی ان انفرادی تجربوں سے کہہ سکتے ہیں ان کے حل تک نہیں پہنچ سکتے۔ پہیلیاں عام مطالعہ سے کی جاتی ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہیلیاں انفرادی تجربہ پر مبنی ہوں۔ پہیلیوں کے عمومی

ذمہ سے خارج ہیں۔ سمسن Samson والی پہیلی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ سمسن کا ساہو اپنے شہنشاہ Timnah کے سفر کے دوران ایک قوم خور شیر سے پڑتا ہے۔ جسے وہ نہتا اپنی قوت ہارو سے مار ڈالتا ہے۔ کچھ مدت بعد جب اسی راستے سے واپس ہوتا ہے تو اس شیر کے ڈھانچے میں شہ کی کھینوں نے محوہ لگالیا ہوتا ہے۔ بھوکے ہونے کے باعث سمسن اس میں سے شہ کھاتا ہے جن فلسطینیوں کے سامنے سمسن نے یہ پہیلی رکھی تھی وہ اسے کبھی نہ بھو سکتے مگر انہوں نے اس کی محبوبہ Delilah جسے سمسن یہ واقعہ بتا چکا تھا کو مجبور کر کے اس کا جواب حاصل کر لیا۔ اور بعد کا سارا واقعہ بائبل کے لوراق میں محفوظ ہے۔ اسی طرح دوسری پہیلی ہے اگر آپ اس کی ٹھری سطر پر غور کریں تو اس میں Challenge ساہ صاف درج ہے کہ یا تو میری پہیلی یا مجھ پر آکر دو۔ یہ پہیلی بھی ایک انفرادی تجربہ پر مبنی ہے جس کی اصل یہ ہے کہ کوئی پرندہ کسی پیل کے سر پر بھونچتا ہے اور اس میں پانچ اندے دیتا ہے۔ یہ اندے وہاں چھٹکنے کی مدت تک رہتے ہیں اور پھر ایک دن پہیلی چھانے والا یہ منظر دیکھتا ہے کہ اندے ٹٹک کر پیلے چادھے نکلتے ہیں اور پھر پانچوں برآمد ہوتا ہے۔ یہ پہیلی بھانپنا بھی آسان نہیں اس لئے کہ یہ انفرادی تجربہ پر مبنی ایک پہیلی ہے۔ ہمیں یاد آئے کہ ہمارے معروف متھک ملاو پنازوں نے بھی اپنے کسی ذمہ دست حریف کو ایسے ہی سوال سے ٹھکست دی تھی۔ قصہ یقیناً آپ میں سے بہتوں کو یاد ہو گا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر یہ ہمارے Folk Lore میں شامل ہے۔ ملاو پنازہ کا سوال تھا کہ بچہ تن، سر، ہمد میں، کیا ہے، حریف کئی روز کی سفرزنی کے باوجود اسکا حل نہ بنا سکا اور ہارنا نا پڑی۔ یہ دراصل ایک موسیقی خاکہ ہے جو ملاو پنازہ کو ایک نئی تجربہ کی بنیاد پر معلوم تھا۔ وہ مفرد قصہ واقعہ یوں ہے کہ جانوروں کی پالی میں کدو کی ایک پیل پر مود سا کدو پک چکا ہے۔ یہ کدو ملا کے سامنے ٹوٹتا ہے۔ جب کدو ٹوٹ کر گرتا ہے تو پیل جو کدو کے وزن سے ٹٹی ہوئی تھی "تن" کی آواز پیدا کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی کسی تٹی ہوئی انگلی یا ہاتھ کی کو کھینچ کر بھونڈنے میں سنی ہو گی۔ کدو ٹوٹتے وقت چوں کے اچھر سے گزرتے ہوئے "سر" کی آواز پیدا کرتا ہے۔ وہ کدو اتفاق سے پانی میں بہہ چکی ہوئی تھی کی پینچ پر گر جاتا ہے اور "ہمد" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ کدو پھری پر گر جاتا ہے تو پھری کا کھلا ہوا یا تکلیف سے "میں" کی آواز نکالتی ہے۔ یہ ہے تن، سر، ہمد، میں کا معنی اس کا ذکر ہم نے اس لئے ضروری سمجھا کہ ذہن انسانی کی ہم آہنگی کا نمونہ اور تعلق سامنے رہے۔ دل کہتا ہے کہ ملاو پنازہ کا معنی گزرنے والے نے انجیل کا مطالعہ ہو گزرا کیا ہو گا۔ اب ہم مغربی ادب سے دو بہت خوب صورت اور دلچسپ پہیلیاں سناتے ہیں۔ یہ ایک سات سطری Stanza ہے۔

White bird featherless,

Flew from paradise,

Pitched upon the Castle walls,

Along came the lord landless.

Took it up handless,

and Rode away horseless,

To the King's white hall.

آپ دیکھیں گے کہ یہ پہیلی حکایت کا ایک حسین نمونہ ہے جس میں تخلیق کار نے حیرت خیز قصہ کو شعر کر دیا ہے جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ ایک پرندہ جس کے پر نہیں، ایک لارڈ یا نواب ہے ملک و زمین، پرندوں کا فردوس سے لڑکر محل کی منزل پر پہنچتا ہے۔

ہاتھوں کے لینا یا پکڑنے کا یہ طریقہ گھڑے کے سوا سب باغی حیرت افزا ہے۔ اس
 نو صورت پتیلی کا اصل ہے سنو SNOW اور سورج SUN۔ آپ ہم اگر پتیلی کی خصوصیات
 کا جائزہ لیں تو پتیلی کی خوبصورتی اور محاکات کا سرور میں مزید ہونے لگتا ہے اور آئینے کے
 اندر عکس بنتی ہے، سفید سفید سنو، آسمانوں سے گری، ٹھنڈی کی دھندل اور مٹھروں پر
 بٹھکی، سورج خواب، اندر سواری کے آقا اور اندر ہاتھوں کے سنو کو لوچنے لے گیا (غائب کر دیا
 کیا) اور پھر اپنے سفید محل (یعنی آسمانوں) میں اندر سواری کے واسطے ہو گیا، وہاں بھان اٹھ،
 کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ پتیلی انکار رفت کوئی چیز ہے؟ کیا یہ پتیلی صرف ایک
 معما ہے؟ ہرگز نہیں، یہ اعلیٰ ترین شاعری ہے جس نے عقلیت بھی اس میں کار فرما ہے، اس
 کے بعد ایک اور پتیلی دیکھئے یہ ایک چو سٹری Stanza ہے۔

In marble walls as white as milk,
 Lined with a skin as soft as silk,
 within a fountain crystal - clear,
 a golden apple doth appear.
 No doors there are to this stronghold,
 Yes thieves break in and steal the gold.

اس میں بھی ہمیں محاکات اپنے مزاج پر نظر آتے ہیں، اچھوتے استعدادت اور تشبیہات
 سب نے مل کر اسے ایک شعری مرقع بنا دیا ہے، دور دورہ ہمیں سفید مرمری دیو دیویں اور چشم
 جھنڈی علامت نرم جلد کا استر، شیشے کی طرح شفاف چشمہ اور اس میں ستر اسبیاں اندر درازوں
 کا قلعہ اور پھر پتھروں کا قلعہ لگا کر سب چرائے جانا لگتا ہے کوئی الف لیلوی داستان کا باب
 بڑھ رہے ہیں، ہر چیز کس تفصیل غلاست سے بیان کی گئی ہے۔ اس پتیلی کا جو آب ہے اندازہ
 اب اگر اس کے خواب کی روشنی میں ایک مارا پلٹ کر دیکھیں تو آپ بھی یقیناً میری طرح
 محض وہ سب کے کہ شاعر نے کس قدر متحرک اور نشاط انگیز قوت تخلیق پائی ہے اور کیا
 عظیم شاعری ہے پتیلی کی حیثیت تو عالمی ہو گئی ہے۔

Anthropologists انسانی عادات اور معتقدات کے ماہرین اور پسیلیوں کے
 مورخین کا گروہ ہے کہ پتیلیاں جیسے کل مقبول تھیں، ویسے آج بھی پسندیدہ ہیں۔ جو Prim-
 alive لوگوں اور اسلاف کے ذریعہ سینہ سینہ چلی آئے والی شاعری کی ایک اہم شاخ یا ذریعہ
 ہیں، یہ سامان تقریباً و تکلفاً اہم کرنے کے ساتھ ہمارے جذبہ تجسس کو ابھارتی ہیں اور
 ہماری ذہنی پسیلی کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ پتیلی کے مل کرنے میں ہم اس کے خصوصی
 لوازم کی دوبارہ جتنی دن سے ہم آہنگی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کوشش ہماری
 قوت تخلیق کو مضبوط کرتی ہے، یونانی ادب میں یہ حیرت انگیز روایت (جس کے حقیقت
 ہونے میں کام ہے) لکھی ملتی ہے کہ دور Homer جیسا جلیل القدر مفکر اور شاعر
 صرف اس خرمندگی میں سر گیا کہ وہ ایک پتیلی کا خواب درست نہ دے سکا، "الہ روایت میں
 حقیقت وہاں ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پتیلیاں یونانی معاشرے میں کس
 قدر تخلیق کی تھیں۔ مزید یہ کہ اس وقت بھی پسیلیوں کی تخلیق اور عمل
 میں چند Pindar اور Theonitas تصور میں جیسے لوگ اپنا وقت صرف کرتے تھے۔
 فن کے علاوہ یونانی نہ ہی چشمہ الیڈم Aldhelm اور نیزاٹن Tatwine جیسے لوگوں
 کا ہم بھی پسیلیوں کی تخلیق کے ذیل میں لایا جاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایٹلیو پیکس زبان میں لکھی ہوئی تھیں پتیلیاں جن کے خالقوں

کے نام بھی کسی کو نہیں معلوم ایک کتاب موسومہ Exelar Book میں درج ملتی
 ہیں، اہل نقد و نظر کے مطابق یہ پتیلیاں نہ صرف شاعری کی اعلیٰ نظر میں ہیں بلکہ اعلیٰ تخیل
 کا بھی نمونہ ہیں۔ ایسی ہی ایک پتیلی یہاں درج کی جاتی ہے۔ اس کا لطف ہمارے معاشرے
 میں جہاں گھروں میں ڈلی روٹی پانے کا رواج نہیں اس قدر نہیں لیکن جس معاشرے میں
 یہ رواج عام ہے وہاں کے ماحول کو تصور میں لا کر ہم بھی یہاں لطف لے سکتے ہیں۔ یا کم از
 کم آقا تو ہمارے ہاں بھی گوندھا جاتا ہے۔

I saw in the corner something swelling,
 Rearing, rising and rising it cover.
 A lovely lady, a lord's daughter,
 Burried her hands in that boneless body.
 Then covered with a cloth, the puffed - up creature.

آپ دیکھیں گے کہ گندھے ہوئے آنے کو شاعر نے Boneless Body سے تعبیر
 دی ہے اور گندھے ہوئے آنے میں کس طرح ہاتھوں کے داخل ہونے کا بیان کیا گیا ہے،
 اس کے پھولنے کو سامنے رکھ کر کس طرح اسے مخلوق کہا گیا ہے، یہاں ہمیں مروجہ انگریز
 آبادی کا شعریار آتا ہے جسے ہم Puffed Creature کے حوالے سے نقل کرنے میں
 مضائقہ نہیں سمجھتے۔

ہمارے دن کی زندگی میں کوفت سے کیا فائدہ
 کہ کلر کی دھواں اٹھاتی خوشی سے پھول جا

ایسے واقعات بھی ہر گز میں درج ہیں کہ لوگ پسیلیوں کے ذریعہ روحانی اختیار کے اظہار
 کا کام لیتے رہے ہیں، ان کی مدد سے قبائلی تارکات نے کرنے کے علاوہ لڑکیوں کی شادیاں
 کی جاتی رہی ہیں۔ سورنھین چیتان کے مطابق Folk Lore کے ذریعہ بہت سی ایسی
 روایتوں کا پتہ بھی ہمیں ان پسیلیوں کے ذریعہ چلتا ہے جو خواب مرم میں گم تھیں۔ آئیے
 اب ہم آپ کو یونانی پتیلی مانتے ہیں جسے Suphnia نے نوٹ کیا ہے۔ Oedi-
 pus سے پوچھا بات آگے بڑھانے سے قبل یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اسے کون سے
 زمانوں کا پسیلیاں بھاننا اور بھاننا اس بات کا ثبوت ہے کہ پتیلی کوئی حقیر چیز نہ سمجھی تھی نہ
 آج ہے۔ یہ پتیلی بھی دو سٹری پتیلی ہے۔

What goes on four legs in the morning light on two
 at noon tide, and on three at night?

کہتے ہیں کہ لوڈیپس Oedipus نے یہ پتیلی اپنے مشاہیرے اور عجوباتی ملاہیوں کو کام
 میں لا کر فوری حل کر لی، فوراً سمجھنے کہ بھلا اور استعدادوں سے کس کا گھڑی سے اس پتیلی کا تھکا
 بنا دیا گیا ہے۔ کھان کی روشنی میں چار ٹانگوں پر چلتا، دوپہر کی صبح میں دو ٹانگوں پر اور رات
 تین ٹانگوں پر چلتا، لوڈیپس نے صبح دوپہر اور رات کے نو قات کو عمر کے موسموں کا
 استعداد پہچان کر گویا پتلیاں کی روشنی، جوانی کی دوپہر کی صبح اور بڑھاپہ ات ہے، اپنے عقلی
 میں چاروں ہاتھ جو پڑھتے ہیں، جوانی میں دو ٹانگوں پر اور جب بوڑھے ہوتے ہیں تو ٹانگوں
 کے ساتھ عصا بھی شامل ہو جاتا ہے، جواب اس کا ہے "انسان"
 اسٹوکی "سکالائٹ" کے حوالے سے اور اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم یہاں کچھ

اور شعر نقل کرتے ہیں جو ہم سب کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ انداز جاری شاعری میں قابل
تعمین نہیں سمجھے جاتے اور گوہر کنڈن کا وہ انداز کی مثال میں نقل کئے جاتے ہیں جس میں ان
اشعار میں چیتانی مصر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔

دہلی کروں گا شہر میں سوئی پہ قتل کا
کیوں اس نے آپ دی مرے دشمن کی قتل کو

اس کا مطلب یہ ہے آسانی سے سمجھ میں آئے والا نہیں ہے، سوئی پہ دشمن کی قتل کو آپ
دیکھنے کا اثر ہم تو یہ مگر کیسے؟ یہ بات محذوف ہے، یہاں گویا شاعر حضرت سوئی کے گوہ
مصر پر جانے اور نورانی سے اس کے جل جانے اور جلے ہوئے پرانے سے مرے کے حصول
اور مرے سے دشمن کی قتل کو آپ دیکھنا سمجھنا تو وہ مصر عوں میں سوہنا عجیب سی بات
ہے۔ ان ساری ایجادیں گویا کے پیش نظر یہ شعر شعر نہیں ایک معرا ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن
شعری ادب سے اس کا بیکار شعر ہونے کے باوجود اثرات ممکن نہیں، یہی دیکھئے کہ ہم نے
اسے چیتان کے ذیل میں قلمبند کر لی لیا۔

نکس کو باغ میں جانے سے روکو
کہ باغ خون پر دانے کا ہو گا

اس شعر میں بھی وہی چیتانی گوہر دکھ رہا ہے، اگر زری میں کہتے ہیں Nip in the
bud یعنی کسی طرائق کو آغاز سے ہی روک دینا اس میں بھی ایسا ہی کچھ انداز ہے، یعنی اگر
نکس (شہر کی کھجی) کو باغ میں جانے سے روک دیا جائے تو وہاں حاصل نہ کر سکے گی۔ وہیں
حاصل نہ کر سکی تو پھر نہ بے گار، معصوم نہ بے گار تو موسم نہ ہو گا تو شہر نہ بے گار ہوگی تو
پر دانے کا خون باغ نہ ہو گا، فلو شعر ہے مگر یہ اور ذمہ ہے، اور اس کی زندگی اس کے
چیتانی مناصر کی بنا پر ہے۔

کیسے نظر نہ لگے اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غالب کا یہ شعر دوسرے شعروں کے مقابلے میں ذرا آسان ہے مگر ہے اس میں بھی چیتانی
مصر، یعنی اگر لوگ مرا زخم جگر دیکھیں گے تو یقیناً ان کو خیال ہو گا کہ زخم لگانے والے کے
دست و بازو کیسے قوی ہیں اور جب یہ استعجاب ہے اس کے دست و بازو کے بارے میں
سوچیں گے تو حد نہ ہے کہ ان کو نظر لگ جائے گی۔ اس خط کی شاعری کے بارے میں De-
layed apprehension کہیں گے، یعنی نظر سے کو سامنے رکھیں تو یہ شعر ایسے ہے بھی
نہیں لیکن ہم ہر گاہ کہ شعر و شاعری میں کر سکتے ہیں کہ یہاں انطباق سے زیادہ ہمیں سمجھنا
چاہئے کہ چاہئے گی۔ مولا علی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ اس بات کا خیال
رکھنا ضروری ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں اور شعر چیتان اور معائن جانے گا۔
اور مثال کے طور پر شاہ نصیر کا درجہ ذیل شعر نقل کیا ہے۔

جہاں چاہے مہتاب شب میچش نے چمن پہ
کھرا صبح روزانے کا، خورشید گردوں پہ

اس شعر کے معنی کارکن خود سمجھیں ہم نے یہ شعر اور یہ قول ساری صرف اپنی بات آگے
بڑھانے کیلئے نقل کیا ہے، یعنی استعارہ اور مجاز جو پسلیوں میں استعمال ہوتا ہے وہ عام
شاعری سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

یہاں سے ہم پھر پسلیوں کی جانب لوٹتے ہیں اور سب سے پہلے ایک دو سطری-Swed-
ish پسلی نقل کرتے ہیں جو پسلی کے بارے میں ہے۔

When first I appear I seem mysterious, But when I
am explained, I am nothing serious.

اس پسلی کا جواب "پسلی" ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس پسلی میں شاعر نے پسلی میں شاعر
نے پسلی کی صرف ایک خصوصیت "پراسراریت" ہونا بیان کی ہے۔ اب جو پسلی ہم نقل
کرنے جا رہے ہیں وہ بھی پسلی کے بارے میں ہے مگر اس میں گزشتہ صفحات میں کی گئی تفسیر
کی روشنی میں پسلیوں کی بہت سی خصوصیات نظم کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

اک سرست راز بھی ہوں
صاف کنایہ ساز بھی ہوں

تشبیہوں کی گور پل بھی ہوں
جگہ غفی ہوں گا بھی ہوں

لفظوں کے دل میں رہتی ہوں
مطلب کو یاد کستی ہوں

جیز دماغوں پہ بھلتی ہوں
مقل کسوٹی پہ تھکتی ہوں

بھینچا کھا کھا کر بھی ہوں
باری کم اکثر بھی ہوں

کرتب اپنے دکھلاتی ہوں
آئینہ لڑا دکھلاتی ہوں

مشکل بھی آسان بھی ہوں میں
زندہ بھی بے جان بھی ہوں میں

بوڑھے ہوں یا لڑکے ہوں
سب ہیں میرے چاہنے والے

صدیوں سے پائندہ بھی ہوں
کلی بھی ختمی آئندہ بھی ہوں

جو مجھ کو اب بھی غمیں جانے
اس کو بھیچو پائل خانے

اپنی کتاب ”آب حیات“ میں شخص الاعلاء مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ایک عورت جس کا نام تھوڑا کام بھگت کا مشرب چاہتا امیر خسرو کے زمانے میں تھی، تھی تو بھگت چنے والی مگر صاحبِ اوق تھی۔ اور امیر خسرو کے من بھی لگی ہوئی تھی۔ آتے جاتے حد پیش کرتی اور فرمائش کرتی کہ آپ ہر ایک کیلئے کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں اگر کچھ جو کیلئے بھی کہ دو کے تو کیا ہو جائے گا۔ قصہ بے حد سنے ہو گا نام بھی رو جائے گا۔ امیر خسرو ہر بار مال جاتے مگر ایک دن اس کے قصے پر یہ چار مصرعے لکھ دیتے۔

لوہوں کی پو پھری ہاجے چو کی اٹھ پھری
 ہاجے کا کوئی آوے ہاں آویں ہاں شری
 صاف صوف گر آجے رکھے جس میں ہاں توسل
 لوہوں کے یہاں سیکے ہاں "چو" کے یہاں توسل

امیر مصر نے ستر سال کی عمر میں 1325ء میں وفات پائی۔ اس زمانے میں اس قسم کا کاروبار کرنے والی عورتیں، عورتوں کے قدیم ترین پیشہ سے بھی متعلق ہوتی تھیں۔ ان چار مصریوں میں اگر ایک خاص لادہ نکال دیکھا جائے تو جوتہ لال ہے۔ وہ لوہے کے پتے کے اور اس پیشہ کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے یہ چار مصر سے پہلی بھی ہو سکتے ہیں مگر ان چار مصریوں کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اردو زمین الیاباد میں تو یہ کون لگا کہ اردو قلعہ کی یہ لہذا انی شکل تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہم یہاں یہ لگا کہ اس لئے لے رہے کہ

Figure 1 consists of two parts, (a) and (b). Part (a) illustrates the sequence of stimuli in the experiment. It shows a fixation cross, followed by a target stimulus (a letter 'A'), and then a distractor stimulus (a letter 'B'). Part (b) illustrates the sequence of responses. It shows a correct response (pressing the 'A' key), followed by an incorrect response (pressing the 'B' key), and then a correct response (pressing the 'A' key).

توڑ سے آگ لیا اتری اس نے بہت رنجش
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آوہا نام بتایا
آوہا نام چا پر پندار ہو جہ کیلی مہری
میر خسرو لایا کیسی وہ اپنا نام بتولی

اس کھلی کے عل میں یہ صوفیہ فرقہ بن پر قائم ہے، اس کا عل ”نہولی“ یا ”نکھولی“، نیم کا پھل ہے، لکن اس کھلی میں جو ہے وہ یہ ہے کہ شمع کے معنی آدھے کے ہوتے ہیں، یہ دوسری ٹکڑی آئینہ کی ہے۔

قاری ہلی آئینہ برکی سوچی پائی ہے
ہماری ہولتے کہ جس آئے وہ نہ دیکھئے جو اس کو پہنچے

اور یہ وہ مغربی کھلی دیکھئے جو دونوں کی عمر کی ہے

بیسویں کا ستر گنتہ دیا
مبارک خان کیا

پہلی ہونے کے علاوہ ہم اگر ان پر شاعرانہ انداز سے نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وزن، قوافی اور تالیف کے اعتبار سے یہ وہی شاعری ہے جو آج ہم سب کرتے ہیں، نیوی والی مگر فی میں قوافی اور تریاخالص ہندی بھاشا ہے جو آج ہم اردو میں نہیں لکھتے اور بھایا (عش کے ساتھ) صاف ہو کر رہ گیا (زیر کے ساتھ) ہو گیا ہے جو ہم سب لاتے ہیں، غزل کی زبان میں مگر نظم میں مستقل ہے اور کیوں نہ ہو، موری اب میری ہو گیا ہے۔ مگر گیتوں میں ویسا ہی ہے سوتی بھایا سوتی کی اصل ہے (یعنی دیکھنا) یہ چار مصرعے بھی بالکل ہماری آج کی شاعری کے تحت خسرو نے "نا" لکھا ہے، اسی لیے کہ "نا" کا استغناء خسرو نے ہی پہلی میں کر چکے ہیں۔ "نہ نیوی" "نہ نیوی" لکھ کر، "نا" ہندی میں نہ کا متبادل ہے جو اردو قافیہ میں بھی اسی طرح مستقل ہے، "نا" معلوم افراد، نا فہم یا نا سمجھ چاہے تو پھر۔

اب خسرو کی وہ بیٹیاں ملاحظہ کیجئے جو اس دور کی اولیٰ ہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہی انداز شعر ہے جو ہم لوگ آج بھی پڑھتے ہیں، صاف لگتا ہے کہ اس کینٹی کے نیچے سے اردو کا چمکتا لہر اتنا جسم نمودار ہو جائے گا۔ یہ آئی کی، لی نہ ہوتے ہوئے صاف سمجھ میں آتی ہے، نظم اور غزل کی نہیں گیت کی زبان اسے مگر شاعری نمودار ہے۔

کرنی

سگری رین مو ہے تنک جالہ نور مینہی جب بھڑوں لاگا
ہر کے بھڑے پھانت حیا کے سکھ سا جن ۲۲ سکھی دیا

کہ کرنی کے ذیل میں ہم اب ایک اور پہلی پیش کرتے ہیں جو یقیناً بہت بعد کے زمانے کی
ہے اس لئے کہ زبان بہت صاف اور شائستہ ہو گئی ہے۔

کرنی

نہ تو بلا ہے نہ جوہی نہ چھیلی کیا ہے؟
میں اگر ہم بتاؤں تو پہلی کیا ہے

لفظیات پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جو چیز عجمی تھی ہے اس کا تعلق بھول یا خوشبو
سے ہے، اگر دوسرے مصرع پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ وہی صنعت ایسا مہر دئے کار
لائی گئی ہے، یہ مگر کچھ دھند لفظ "اگر" سے تیار کیا گیا ہے، ہم لوگ عام طور سے "اگر" کو
اگر بستی کے علاوہ نہیں جانتے، مگر اس کا اصل "اگر" ہے جو دوسرے مصرع میں صاف
موجود ہے، یہ شاعر کا کمال ہے کہ "اگر" کو اس تیز سے استعمال کیا ہے کہ اگر نام بتا دیا جائے
تو پہلی کیا ہوگی، اس طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا۔

دو ٹخنے: یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے، دو ٹخنے وہ بھارت یا پہلی ہے جس میں سوال تو دو الگ
الگ ہوتے ہیں مگر دونوں کا جواب ایک ہوتا ہے، امیر خسرو نے اردو کے علاوہ اس زمانے
کے رواج کے مطابق اردو اور فارسی کے اشتراک سے بھی یہ دو ٹخنے لکھے ہیں۔ اس صنعت کو
"ووالہا نہیں" کہا جاتا ہے اور جس کی مثال میں انہی کی معروف نظم "خالق پری" پیش کی جا
سکتی ہے۔ جس کے مصرعے "پیار اور — آؤر سے بھائی، بھئی اور — بھڑری مائی، زبہا
زوحام و عام رہے ہیں، ان مصرعوں کے ساتھ غالب کا ایک اقتدار آگیا، سن لکھتے:

مولوی فضل الحق صاحب مرزا غالب کے بہت دوست تھے، ایک روز مرزا ان سے ملاقات
کیلئے گئے، ان کی ملاقات تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آتا تو خالق پری کا یہ مصرع پڑھا
کرتے، "پیار اور — آؤر سے بھائی، چنانچہ مرزا کے استقبال کیلئے اٹھے اور یہی مصرع پڑھا،
مرزا انھی ٹخنے ہی تھے کہ اتنے میں مولوی صاحب کی طوائف دوسرے والان سے اٹھ کر
پاس آئیں، مرزا نے فرمایا، مولوی صاحب اب دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجئے، بھئی اور —
بھڑری مائی، مولوی صاحب ہنس دیئے۔
آئیے اب امیر خسرو کے دو ٹخنے دیکھتے ہیں:

گوشت کیوں نہ کھایا، ذوم کیوں نہ گایا؟

جواب "کھانا تھا" یعنی گوشت کھانا تھا اور ذوم کے گئے میں "سر" نہ تھا، ہم علامہ خانگے میں
سر نہ ہونے کیلئے کہتے ہیں کہ لاناں کے گھا نہیں ہے۔

اگر کیوں نہ کھایا — وزیر کیوں نہ کھا؟

جواب "کو انا تھا" یعنی اگر بطور دانے کے تھا اور وہ جسے وزیر کھانا تھا غلگند تھا کو انا تھا۔

سنوہ کیوں نہ کھایا — جو ما کیوں نہ پتا؟

جواب "تھا تھا" یعنی سنوہ جب تک نہیں کھایا جا سکا جب تک کھانا نہ پتا نہ ہو اور جو ما
جب تک پتا نہیں جا سکا جب تک "تھا" نہ ہو۔

یہ دو ٹخنے لکھتے ہوئے راقم الحروف کے ذہن میں بھی ایک دھند آگیا اور رواج کے چٹا ہوں۔
سر کیوں نہ باندا تھا — پاں کیوں نہ کھایا؟

قبل اس کے کہ ہم نے ان ٹکڑوں کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کریں، ان کی صنعت
پر کچھ عرض کرتے چلتے ہیں دیگر ٹکڑوں کے مقابلے میں یہاں خسرو نے صنعت تعلیل
(جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) سے کام لیا ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں جو معانی بیان
کئے ہیں جو وہ نظم کے دواشار دیتی ہیں کہ یہ ساری ٹکڑو سا جن کے بارے میں ہے جب کہ
پونجے مصرعے میں استغما یہ انداز اختیار کیا گیا ہے "اے سکھی سا جن ۲۲" اور پھر خود ہی
ثواب کر کے دوسری بات بتادی، "اے سکھی دیا، دان یا بھول اور یہ انداز کمال نظر اور کمال
قدرت شعری دونوں پر استدلال کرتا ہے۔ آئیے اب ان کو ایک زانو یہ نگاہ سے دیکھتے ہیں،
یعنی دراصل یہ سب باتیں دو سکھی سے کہ تو سا جن کے بارے میں وہی ہے مگر اس خیال
سے کہ یہ بات بے شری کی ہوگی، جس کی اجازت سراج میں نہیں یا کم سے کم مستحسن نہیں،
اس لئے پردہ پوشی کر جاتی ہے اور کہتی ہے کہ نہیں، "سا جن تھوڑی ہے، وہ تو دیا تنک اور
اصول کی باتیں کر رہی ہے۔ اس طرح اس میں صنعت تہلیل مار فائدہ کی موجودگی کا پتہ چلتا
ہے، تہلیل مار فائدہ اس صنعت کو کہتے ہیں جہاں شاعر شعر میں کوئی ایسی بات کہتا ہے جس
سے دو واقف ہونے کے باوجود انہیں نہ سنے کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً غالب کے شاعر اور کا
یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

نہ ہم سمجھ نہ آپ آئے کس سے
بیونہ بوجھ بیونہ اپنی جہیں سے

سگری، ساری ہو گیا ہے، مو ہے، میرا لا جانے گا، بھینسی، بھائی ہو گیا ہے، بھڑوں کو
بھڑو، "اگر کوئی کہنے لگا ہیں، سلوہ ہم آج بھی ہوتے ہیں، لیکن کے معنوں میں، نیک فارسی کی
مصرعیں ترکیب ہے، نیک اور پیکا کے قافیوں کے استعمال کو دیکھئے، میر حسن اور پنڈت
دیا شنکر نسیم کی مشابہت بعد ان کے بعد تک آپ کو ایسے قافیے مل جائیں گے۔ ایک زمانے
تک بھول اور پائے معروف کا یہ فرق جاننا سمجھا جاتا تھا، اب متر و ک ہے اور ساتھ ہی
ساتھ محبوب بھی دوائے ۱۲ ایک طرح سے تک "اے" ہی لکھا، "تھا تھا" یہ بھی چارہ پائیوں
پہلے کی بات ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ یہ زبان ذراستہ رویدل کے ساتھ گیتوں میں آج بھی
مستعمل ہے تو شاید اتفاقاً نہ ہو گا بلکہ وہ اردو شعر اور جو آج ہندوستان میں شعر کہہ رہے
ہیں، یہ زبان ان کی زبان کے زیادہ قریب ہے کہ وہاں ہندی الفاظ کا رواج عام ہے۔ نیک اور
بات جو غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ شیت اور ساطت کے اعتبار سے ان ساری کہ گھڑیوں میں
وہی ہوا، اے قطر کا قاب استعمال ہوا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناخن والی کہ
کرنی ہم تک پوری نہیں پہنچی، اس وقت ہمیں یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ پہلی والی پہلی جو ہم نے
اپنی دہائی کتب میں پڑھی تھی وہ بھی نصف دہائی کے ساتھ ساتھ نصف شدہ تھی۔ وہ
سکتا ہے کہ یہ پہلی بات سے کارٹون اور راج ڈال مہارت ہی میں یاد ہو۔

آہا ہم میں کا مٹا چہا ہم نیلی
میر خسرو یوں کہیں تو بوجھ پہلی موری

جواب: ”مٹا کر تھا“ یعنی دولہا (مٹا کر) تھا تو سہرا لگس کے بعد عتا اور پان دہانہ تھا اس لئے کہانی نہ کیا۔

اب وہ انسان روختے مٹا کر کیجئے :

سو اگر راجہ پایہ — سو پتے کو کیا چاہیے ؟

جواب: ”دوکان“۔ یعنی سوداگر کو کاروبار کیلئے دوکان چاہیے اور کن کئے کو دوکان (وہ ہے) کا مطلب کن کنیا (ظہیر کان والا ہیں)

تخت راجہ کی پایہ — غلاب کو کیا چاہیے ؟

جواب: ”چاہ“ یعنی پیاسے کو کھول (چاہ) اور غلاب کیلئے (چاہ) محبت درکار ہے۔

ظاہر چہ پایہ کرد — قوت مغز کو کیا چاہیے ؟

جواب: ”بادام“ یعنی ڈاکٹر کس سے کیا جائے ”وام سے“ اور دماغی قوت کیلئے ”بادام“ مفید ہے۔

وہ سچے اور کمرے کے مقابلے میں پسلیاں زیادہ مشکل اور تجسس خیز ہیں، ان کا کمال مشکل تر ہوتا ہے اور یہ شاعری کی بہترین مثال ہوتی ہیں، مذکورہ دو شخصوں کو اگر ہم نظر غائر سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ صنعت ایسا م کی معکوس صورت ہے جو شاعر نے جو رانی طبع سے خلق کی ہے۔ درج ایل، پسلیوں میں بہت سی تو بہت آسان اور ہم سب کی سنی ہوئی ہیں مگر بعض ان میں سے بارہ روزگار بھی ہیں اور مشکل بھی۔ پسلیوں کے اعتبار سے بھی اور شاعری کے حوالے سے بھی، ان میں طوئے فکر بھی اوج کمال پر نظر آتی ہے، ملاحظہ کیجئے :

پولی : اتنی سی ہلدی سارے گھر میں مل رہی

جواب: ”ہلدی“ انا قہین پیوستی زمانہ باب بھی شمار ہو سکتا ہے، ہلدی اور روشنی اور رنگ سے شمار ہیں اور غیب ہونے کی قدر سے رکھتی ہے۔

پولی : کٹورے پر کٹورہ اچھاپ سے بھی گورا

جواب: مارل

پولی : اتنی سی، صیا گزھر کی چٹیا

جواب: سوئی

پولی : ہری تھی من بھری تھی، تو لاکھ موتی جڑی تھی، راجہ ہی کے باغ میں وہ شالہ نوڑے گھڑی تھی۔

جواب ہے ”بھرا“ جسے چھل بھی کہتے ہیں، اور اس پولی کے محاکات کا کمال دیکھئے، پولی کی محتاجت سے سارے لوازم پر غور کیجئے، استعارات پر نظر ڈالئے مٹی خوش ہو جائے گا۔ ہری من بھری، تو لاکھ موتی جڑی، راجہ ہی کا باغ، وہ شالہ نوڑ دینا، سچان انہ، پولی تو شاید آسان ہو مگر ایسی پولی تخلیق کرنا ایک ذریعہ دماغ اور جہاز روزگار شخص کا کام ہے۔ ایک اور پولی دیکھئے :

سین پانی بھی کوئی سوتا نہیں، جسی مر کوئی روتا نہیں

صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ لہجہ کے ماحول کی پولی ہے، سین پانی، چٹائی کے چھنے چھکڑا فرش کو کہتے ہیں، اس پولی میں بھی تضاد کاغذ کور ہے، Snow، دلی پولی کی طرح اس کے بھی وہ

جواب ہیں، ایک ”دیریا گورو دوسرا“ ساپ“

راجہ کے مرے پر وہ عام رولن ہے، نہ رولنے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو کہہ لیں، ظالم تھا اور ظالم کے مرے پر رویا نہیں جاتا، ساپ موڈی جانور ہے، جسی (لگن) بھی ساپ کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس پر سولے کیلئے ہوتا ہے، مگر جان کے خطرے کے باعث سولے آب جو صوب میں ٹپکا ہو ستر معلوم، جی ہے اس پر کوئی نہیں سوتا، اب راجہ دو پسلیاں ۱۵۰۰۰۰ کہتے

پولی : دن پر وہ (نہیں) وقت نہیں باہر نکلتے سے

مگر فرصت نہیں ملتی اسے دن رات چلنے سے

دن پر وہ نہیں سے پتہ چلتا ہے کہ جواب جو اس کا ہو گا، وہ سچے نمونے ہو گی، تضادات اس میں بھی وہی ہیں کہ باہر تو نکلتی نہیں، تو پھر دن رات چلتا ہے، معنی دلہو ۹ زن پر وہ نہیں استعارہ ہے، ذہن پر زور ڈالنے سے ہو سکتا ہے کہ دن رات چلنے کی مناسبت سے ہمارا ذہن گھڑی کی طرف جائے کہ ہر وقت چلتی بھی ہے اور گھڑی اسم مناسبت بھی ہے مگر پر وہ نہیں کا جو کھڑا پولی میں ہے گھڑی اس پر پوری نہیں اترتی، تو پھر اس کا کیا جواب ہو گا؟ اس کا جواب ہے ”نہیں“ یہ بھی تخیل اور تلاش کی ایک اعلیٰ مثال ہے، ہمیں گھڑی کے ذکر پر مومن خان مومن کی پولی یاد آئی جو گھڑیاں کے بارے میں ہے، اسے بھی من لیجئے۔ مومن نے دیسے تو بہت سی پسلیاں کھلی ہیں مگر ریکارڈ پر اکثر اس پولی کا ذکر ملتا ہے، یہ چہ معر عوں کی پولی ہے

نہ ملے وہ جب تک کہ کوئی بلانے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کہہ آئے
نہیں چہرہ پر وہ نکلتا رہے
زمانے کا احوال بچتا رہے
شب و روز غوغا مچتا کرے
اسی طرح سے یہ کہایا کرے

(کوک سے چلنے والا گھڑیاں سکا کر)

پولی کے سارے لوازمات اور اشارے تو ہیں مگر نہ صورت شاعری نہیں، لگتا ہے بہت جلدت میں لکھی گئی ہے۔ جلدت کی بات ہم نے اس لئے کہی کہ مومن میں بڑا بڑا کھر خوش فکر شاعر اگر توجہ دیتا تو یقیناً شعری عنصر بھی خاص اچا کر ہو سکتا تھا، پولی

اک درزی نے چار سیاہی تارے بن سوئی
جگہ جگہ پر بچا کر گئے یہ کیا حکمت ہوئی

وہی تضادات کی یاد فرمائی ہے، اس کا جواب ”ساپ کی پولی“ ہے اب اس جواب کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ کتنی بلیغ، خوب صورت اور صاف پولی ہے، کھیل بلاشبہ اک چار ہے، جنہوں نے اسے دیکھا ہے وہ بتائیں گے کہ اس میں بائیس ساپ کی اپنی جلد کی طرح خانے خانے سے بنے ہوئے ہیں جنہیں پوند کا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں سوئی تارے کا بھی کوئی دخل نہیں ہو تا جو محض کیلئے جڑی بن کر ہے۔ جس پر شاعر نے انھیں کاغذ کیا ہے، نہان کو دیکھئے تو ترقی یافتہ اردو لکھی ہے، ہائل، مٹی مٹی ہم لوگ آج کل بولتے ہیں، مرادات السطیہ قلم تر موجود ہے، یعنی درزی، چار، سیاہ، سوئی جگا، یہ تہ چند میر سے خیال میں

یہ کبلی مرادات السنظیر کی مثال کیلئے ملازمین خود ہے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تمام محققین نے یہی معنی و مطلب شعر کو دیکھے تھے اور جب کوئی انہی یا نیا آئے والا شعر کی فرمائش کرتا تو ان لوگوں کو مان جاتے مگر اسرار بے حد پر یہ دیکھتے کیلئے کہ آیا وہ شعر سمجھتا بھی ہے یا نہیں یہ معنی و مطلب شعر سناتے اور اگر سننے والا خود چاہے تو سمجھ جاتے کہ قافی اوق ہے اور کون سناتے، ان اشعار میں ہم نے وہ شعر بھی دیکھا ہے جو ہم اپنے چھپنے سے کبلی کے طور پر سننے آئے ہیں، تذکرہ نگاروں کے اس دعوے کی تردید کیلئے ہمارے پاس کوئی جو لا نہیں مگر اس میں ہمیں کوئی شک نہیں کہ یہ شعر ایک بہترین اور خوبصورت کبلی ہے۔ کبلی :

نونی دریا کی کلائی زلف ابھی بام میں
مورچہ گھل میں دیکھا آوی بارام میں

اس کبلی کا جواب ”آٹھ“ ہے، بہترین سمجھی ہوئی زبان تضادات اور استعارے خوبصورت اور قرین فہم مگر چونکہ دیکھنے والے جواب کو سامنے رکھ کر اس پر غور کیجئے، دریا کی کلائی کا ٹوٹنا یعنی رونا، آنسوؤں کا ٹپکنا، ان کا پکھلنا پر الجھنا، آٹھ کی پتی کا پتہ جو اگر الٹ کر دیکھئے، جو ہم لوگ چھپنے میں اکتا کرتے بھی تھے، سرخ قفل کی طرح ہوتا ہے اور پتلی کا وہاں ہونا چوری آٹھ کو بلا ہم سے تشبیہ، یہ شعر ام کے یہاں عام ہے۔ آٹھ کے اندر دیکھنے والے آدمی کا گلن نظر آتا، یہ سب باتیں ایک مکمل اور نادر کبلی ہونے کی دلیل ہیں اور ہمارے نزدیک یہ قطعاً بے مطلب نہیں ہو سکتا ہے کہ اگر یہ شعر ہوتا تو بے مطلب ہوتا مگر یہ شعر تو ہے نہیں، یہ تو کبلی ہے۔

اور حقاً قافی کبلی معروف عالم ابن مقفی ام علی صاحب قندہ کی طرف منسوب ہے، منسوب کا لفظ ہم نے احتیاطاً استعمال کیا ہے، گو بیات کہ وہ بے پناہ شعری صلاحیت رکھتے تھے ہمارے ذاتی حس میں ہے۔ کبلی

بدلے لگی کا ہوا خواہوں سے یہ پایا ہے
بے خطا مجھ کو رسن ہاتھ کے لٹکایا ہے

کبلی کا جواب ”فرشی پھرا“ ہے جسے بہت پر لٹکایا جاتا ہے اور دوسرے لوگ یا ملازمین سمجھتے ہیں اور چھپنے کے نیچے چھپنے والے ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں، دوسری تضاد کا بیان۔ ہاں خواہوں کا مطلب ہمارا دوست اور طرفدار کے ہیں لیکن اس کا لفظی ترجمہ ہو گا ”ہوا کے طلبکار“ آپ دراصل کبلی کو خود سے دیکھتے تو لطف شعر آجائے گا۔ اس کبلی کے مصرع چالی کو ذرا موزون کی کبلی کے مسرے ”نہیں چور پر کاہ لگتا ہے“ سے موازنہ کر کے دیکھئے کہ یہ مصرع کتنا فصیح ہے اور بلیغ ہے اور یہ وضاحت آپ کو فکا ”چور“ اور ”بے خطا“ کے خیال سے ہو جائے گی، یہ خواہوں کا لفظی صنعت ایرام ہے اور اب یہ کبلی دیکھئے

جیتا ہے پان پان یہ قفل ابھی نہیں
دیتا ہے ہاتھوں ہاتھ پان ابھی نہیں
کر دے گا ریزہ ریزہ وہ جس شے کو پائے گا
سب اس کا جھوٹا کھائیں وہ ہرگز نہ کھائے گا

دونوں پہیلیاں ہمیں محترمہ فیم بانو سلیمہ کا ملیہ ہیں، اس کبلی کا جواب؟ مگر ذرا فہم ہے پان کھا کر آجائیں تو بتاتے ہیں، لیجئے یہ تو آپ نے خود سوچ لیا، جی ہاں اس کا جواب ”سرد“ ہی ہے، اس میں بھی وہی تضادات موجود ہیں، چلنا اور نہ ٹھکنا، ہاتھوں ہاتھ رہنا اور نہ پھلنا، سب اس کا مجموعہ یعنی منہ سے نکلا ہوا کھائیں اور یہ نہ کھائے، کبلی کبلی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ شعری مرقع بھی ہے۔ سرد کا ذکر آیا تو ایک اور کبلی سن لیجئے۔ یہ ایک قدیم کبلی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کن کن مراحل سے گزری ہے :

طوطا، اکھا، لوار، شیر
ان چاروں کو لائے گھیر
اے سکھی ہم میں ہے ایسا کین
ان چاروں کے خون کو پینا

ہم حقیقی طور پر تو نہیں کہہ سکتے مگر اس کبلی کی ساخت لفظیات اور زبان سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کبلی امیر خسرو کی ہے۔ جواب ہے اس کا ”پان“۔ اگر یہ امیر خسرو کی کبلی یا اس دور کی کبلی ہے تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں پان آٹھ سے آٹھ سو سال پہلے بھی مقبول اور رائج تھا۔ یعنی یہ کتنا بھی جاب ہے کہ پہیلیاں رسم و رواج کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ دیکھئے شاعر نے پان کے لوازمات کی طرف کس طرح استعارہ کیا ہے :

طوطا پان جو ہر اہوتا ہے، لگے چور جو مفید ہو جا ہے، لوار یہ ایک کتنی رنگ کا پرند ہے، شیر چھالی کے رنگ کا ایک پرند ہے۔ پھر جب پان کھلیا جاتا ہے تو بیک بستقی ہے جو خون کے رنگ کی ہوتی ہے۔ یہاں ہم معروف مزید شاعر ساغر خیانی کے والد گرامی مرحوم مولوی لکن صاحب جن کا تخلص شاعر قناد ہے پنا لقم کہتے تھے، ان کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ اس امید پر کہ آپ بھی اس سے متھوٹا ہوئے بغیر نہیں، ہیں گے۔ یہ شعر ان کی ایک نایاب لقم ”پان کی گوری“ کا مطلع ہے :

اس پان کا رہے گا شاعر جنوں بدسوں
کھائی ہے اک گوری تمہیں کے خون بدسوں

اب ہم کچھ تاری پسینوں کا ذکر کرتے ہیں رفاہی، اردو اور انگریزی کے مقابلے میں قدیم تر زبان ہے، میرے خیال میں اگر انگریزی اور اردو زبانوں کی تاریخ دیکھی جائے تو دونوں کی تاریخ خاص مطابقت رکھتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ انگریزی سوڈیڑھ سو سال زیادہ پرانی ہونے کے ساتھ خوشحال ماحول میں پئی ہو گئی ہے اور اردو طاق کش اور بد حال ماحول میں، انگریزی نے گزرا اور حالانکہ فضائیں میں سانس لی ہے جبکہ اردو نے غامی کا دور دیکھا، اردو کی طرح انگریزی کی اصل بھی کچھ نہیں لیکن دونوں زبانوں کی حیثیت ریختہ کی ہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ البتہ ہے کہ اردو لکھنے والے خود اردو کے دور بے آواز رہے ہیں اور اگرچہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا پھر بھی اس کو مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ سمجھ دیا جاتا رہی ہے۔ خیر بے شک یہ ہمارا اس وقت کا موضوع سخن نہیں اس لئے ہم اسی بنیاد محترمہ پر جمود گریہات کو آگے بڑھاتے ہیں، اب تاری کی کبلی دیکھئے :

کچے مرغ دیم نہ بال نہ پیر
پر دام زمیں تا قفل ہے غم

ضمیمہ	سکون	خمن	موی
بیوت	خورد	گوشت	آوی

یعنی ایک ہندو ہے جس کے زبال ہیں نہ پر لیکن وہ زمین سے آسمانوں تک پہ خوف و خطر پر والا کرتا ہے۔ سکون و شانمانی کا دشمن ہے اور آوی کا گوشت اس کی خوراک ہے۔ یہ پھیلی کھالیں استعداات اور صنعت تعداد کا اندازہ نمونہ ہے اور پھیلی ہونے کے ساتھ ساتھ علوئے تکمیل کا ایک بہترین شاہد ہے۔ اس کا عمل "فکر" ہے۔ اب اگر جواب کی روشنی میں ہم سکوس ستر کریں تو دیکھیں گے کتنی جامع اور فلسفیانہ پھیلی انٹرن کی گئی ہے۔ فکر کا زمین سے آسمان تک اڑنا اڑنے کی حمایت سے پرندہ کہتا، پرندہ ہوتے ہوئے بال پر ہونے کا تجربہ، خوشی اور سکون کا دشمن وہ نالور آوی کا گوشت کھانا یعنی جس آوی کو کوئی فکر لاحق ہو جائے اس کا گوشت کھانا مایہ ناست ہے۔ اس کو زمین میں رکھ کر اگر ہم Snow نامی پھیلی کو دیکھیں تو ہمیں ایک اندازہ فکر کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ پھیلی

جسٹ آں جسٹ کہ مانند پری ہار گند
ہے پر ہاں پر ہاں ہے وہن آواز گند

موجود کیا ہے کہ پریوں کی طرح ہار کرتی ہے، بغیر بال و پر کے اڑتی ہے اور بغیر منہ کے آواز کرتی ہے، اس کا جواب ہے "چنگ" سڈرا پھیلی کی طرف لوٹنے کے شعری کمالات کے علاوہ بھی فخر نے عبادت میں پھیلی کے سارے لوازم بیان کئے ہیں۔ پری کی طرح ہار کر بغیر بال و پر کے اڑنا، جب است زور سے لوجھ اور کھینچا جاتا ہے تو اس کے کاغذ اور فلدا میں موجود دم اکے گھرا لے گا تو پید اہوا، یہ سب باتیں ہم سب کے مشاہدے کی ہیں۔ وہی پھر لفظوں تضادات اور استعداات کا تاباں ہر پھیلی کا گھر ہیں ہر سبق احسن بیان کئے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے بدلتے خود چنگ اڑائی ہے اس پھیلی کا لطف اٹھائیے گی گنا زیادہ ہے۔ اب یہ فارسی کی آخری پھیلی ملاحظہ کیجئے جسے بعد ہم اپنی زبان سے تاریخ کوئی، معاد اور کج کی مثالیں پیش کریں گے پھیلی:

کے سب جب ویدم کہ بخش پا دودم وارو
قالب تر الیں بيشنو، مہن پشت دم وارو

یعنی یہ ہونے کے ایک عجیب گھوڑا اور کچا کہ جس کے چوہر اور دم سم ہیں اور یہی نہیں چوہر و چوب ترین بات یہ ہے کہ اس کی چوہر کے درمیان میں دم ہے۔ آپ نہیں کے کہ مشکل پھیلی ہے، کچھ ایسا کھانا، اتنا کہ یہ ہے کہ یہ استعمال کی چیز ہے، اب دیکھئے کہ استعمال میں کون سی چیزیں ہیں جو ناگھیں، کتنی ہیں باطن حصوں کو ناگوں سے تشبیہ دی جاسکتے۔ میو، پانی، اسٹول، چنگ، صوف، تخت، اگر تخت، صوف اور چنگ یا مسری کی چیز ناگھیں ہوں بھی تو وہ کیا چیز ہو گی جنہیں ہم کھا جائے اور پھر پشت کے درمیان دم کہاں سے لائیں گے؟ یقیناً یہ کوئی اور چیز ہے، یہی ہاں آپ ٹھیک پہنچ گئے، آج کل کے بچے اسے شاید نہ جانتے تھے وہ ان میں سے کہ اس کی شکل اب کافی تبدیل ہو چکی ہے۔ اور ہم جس خزانہ کو چاہتے تھے وہ ان میں سے بہت سونے و چاندی ہو گی۔ فخر نے خزانہ کو گھوڑے سے استعارہ کیا ہے، ہر پلڑے کی تین دھیریں کو پائیاں کھائے اور جس زوری سے اس کو اٹھاتے ہیں اور جوڑ مہان میں ہوتی ہے اسے دم کھا جو واقعی دم کی طرح ہوتی ہے۔ ہم اس پھیلی کے عمل کی طرف اسی دم کے راستے پہنچے تھے۔ کہیں کتنی جامع اور سرسوز پھیلی ہے۔ اگر آپ اس پھیلی کو Fantasize

کر سکیں یعنی تصورات کی مدد سے ایک ایسا گھوڑا تشکیل کر سکیں جیسا اس پھیلی میں ہے تو خزانہ کی شکل پر وہ تشکیل پھر کر آجائے گی، یہ پھیلی بھی دیادی پھر لفظی تضادات کا پور نمونہ ہے۔

اردو شاعری میں معانی ایک قسم کی صنعت اور صنعت ہے اور اسی طرح کج بھی ہے، تاریخ کوئی اگرچہ ہر اور است معانی تعریف میں نہیں آتی لیکن جیسے ہم نے کچھ شعروں میں چیتائی عناصر کی نشاندہی کی ہے اسی طرح بعض شاعر نہیں بھی ایسا ہی چیتائی عنصر رکھتی ہیں۔ تاریخ کوئی میں صنعت، خزانہ اور تعریف میں جہاں زیادہ وسیع و معرے لکھے گئے ہیں۔ مولانا آزاد نے انہیں بھی تاریخ کوئی کی صنعت سے بہت کر معیار قرار دیا ہے، مثلاً مومن خان مومن نے اپنے والد کی تاریخ قات پوں کہی ہے

ممن المام گشت سال وقات
مکہ ظام نمی بہ حق ہرست

اس میں اگر ظام نمی کے بعد لو میں حق کے بعد اہوا میں تو پورا پورا سال وقات نقل آئے گا جو ۱۲۴۱ھ یا پھر اپنی صیغہ میں وخر کی تاریخ مرگ پوں لکھی تھی۔

خاک ہ فرق دولت و دنیا
ممن فکلام خزانہ دم خاک

اس میں اگر خزانہ کے بعد اومیں سر خاک یعنی "خ" کے بعد جمع کریں تو ۱۲۶۳ھ لکھ جائے جو سال صلت ہے۔ چونکہ یہ ہر پھیلی فوری طور سے سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے بھی اور اس لئے بھی کہ کمال مولانا آزاد اصول فن تاریخ کوئی کی رو سے غور سے زیادہ اعداد کا خزانہ اور تعریف قدماء نے جائز نہیں سمجھا ہے۔ مولانا آزاد نے ان کو معاشقہ کی چیز کہا ہے۔ میر سے خیال میں اس اصولی قد غن کی کوئی خاص اہمیت نہیں، وہ اس لئے کہ اواز ہو سکتا ہے کہ یہ اصول مرتب کرتے وقت مرتبین کے سامنے صرف ایسی مثالیں ہوں گی جن میں نو اعداد کا خزانہ یا تعریف کیا گیا ہو گا۔ دوئم یہ کہ مومن خان مومن اس پائے کے شاعر تھے جو ان اصولوں کو دھت دینے کے بجائے سمجھ جاسکتے ہیں، سوئم اس لئے بھی کہ بعد ازاں اس اصول کی پیدائی نہیں کی گئی اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں نو سے زیادہ اعداد کا خزانہ یا تعریف کیا گیا ہے، پتہ تھے یہ کہ جب نو کے بعد نو تک کے خزانہ کیا جاسکتا ہے تو اس سے بڑے اعداد میں کیا فراموشی ہے؟ جب کہ حروف ابجد میں ایک ہر نو تک کی قدر کے حروف ہیں اور پھر نو اعداد کے خزانہ یا تعریف کے تعین کی بنیاد کیا ہے؟ خیر یہ بھی حلال معترفہ درمیان میں آگیا جس کا ہمارے مضمون میں اس کے سوا کوئی ربط نہیں کہ غ قطع میں آہڑی ہے سخن مستزاد بات، تاریخ کوئی کے بعد اب آتے ہیں، "معانی طرف"۔

مثال اسر موطی گودی گجر اچن، یہ صرف ایک مصرعہ ہے اگر آپ اسے مصرعہ تسلیم کریں تو لیکن چونکہ نظام اللہ خان انشاء کی تخلیق ہے اور شیخ قلندر بخش ہرات کے ہاں ہے اس لئے ہم نے اسے مصرعہ تسلیم کر لیا ہے، یہ ابھی خاصی وسیعہ پھیلی ہے۔ اگرچہ معانی ذیل میں دو سب پایاں بھی آتی ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، ہم نے یہاں اس کا الگ سے ذکر اس کے اچھوتے پن کی وجہ سے کیا، ایسے مضمون میں اشارے کو پہچان کر اگر عمل کیا جائے تو اصل و آمد ہو جاتا ہے بیجا کہ اس میں سر موطی اور گودی یعنی بے سرو پا رہا اب اگر گجر اچن کا سر "ک" "نور مج" "ن" "کات" میں تو جرات دہ جائے گا۔ لفظ نور ہات

اس میں یہ ہے کہ جرات کی والدہ کا نام گم اتنی قدر ایک اور شکل بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ مومن
عالم مومن کے ایک دوست متحابہ اس کے ہاتھ میں ہے اور یہی ہی الوداع ہے۔ اس
میں بھی لکھنے کی ترکیب استعمال موزوں ہے

نے کیوں کر کہ ہے یہ کار
ہم اُسے بات انی پر

یہ مصرعہ اردو شاعری میں جو روزگار ہے اور شاعری کا شوق اور پروا قلیل کا پتہ دیتا ہے اصل
اس کا لکھنے سے قلم ہو گا۔ چنانچہ ہم لفظ ہم بات اور یار کو الوداع میں تو ہم "م" ہو جائے
گا۔ بات "باب" اور یار "راسے" میں تبدیلی ہو جائے گا اور اس طرح متحابہ اسے کا نام
حاصل ہو جائے گا۔

جمع عموماً اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ آگ قطع یا نظم ایسی کہی جائے جس میں
اہتمام رکھا جائے کہ مطلوبہ ہم کے حروف قطع یا نظم کے پہلے مصرعہ کا آغاز بالترتیب ہم
کے حرف سے ہو، مثلاً اگر کسی کا نام احمد علی ہے تو قطع کے پہلے مصرعہ کا پہلا لفظ الف سے
شروع ہو گا اور دوسرا "ح" سے اور تیسرا "م" سے علیٰ ہذا القیاس، حتیٰ کہ نام مکمل ہو جائے،
یہ عمل عمل ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی مصرعہ یوں لکھا جائے کہ مطلوبہ ہم معنوی
مثبت سے نظم کر دیا جائے جیسے نو اب الیٰ علیٰ عارف جو غالب کے خسر تھے کہ جمع یوں

ہے

ع "مجھ کو گار کو الیٰ عشق" یہ مومن کی اصلاح کے بعد یوں ہو گیا "میں گنگار یوں الیٰ
عشق" اس اصلاح کی کیا ضرورت تھی ہم نہیں کہہ سکتے۔

شاہ نصیر نے ایک کج ایک طوائف کا جس کا نام لکھا تھا تھا، اس کا پس منظر میں لکھے پھر وہ شعر
پیش کریں گے۔ ایک ہندو منشی جی ایک مسلمان طوائف جس کا نام لکھا تھا پر عاشق ہو گئے
اور شادی کرنے لگے مسلمان ہو چکا اگر وہ اپنا دین چھوڑنے پر راضی نہ تھی، شاہ نصیر نے
اس خبر کو سن کر یہ شعر کہا:

جس طرف تو نے گیا ایک اشارہ تہ جیا
نچا تو تری چشم کا مارا نہ جیا

نچا میں "ن" کو اختلاف کر کے یہ کج حاصل ہوا ہے، کج کو ہم نے اس لئے پہلی، معیار
تجارت یا پیشان کے ذمے میں لکھا ہے کہ اس میں بھی کوئی کی طرح نتیجہ یا عمل تک پہنچنے
کیلئے اشارہ Clue کی ضرورت ہوتی ہے، دماغ پر زور دینا پڑتا ہے اور شعر، مصرعے یا نظم
سے شعر کے مطلب مقصود نہیں ہوتے پھر جواب مقصود ہوتا ہے خواہ نام کی صورت ہی
میں کیوں نہ ہو۔

تسلی



وہ مختلف ہے مگر اس کا ظاہر و باطن
منافقوں کی طرح مختلف نہیں ہرگز

افتخار نسیم

کانیا شعری مجموعہ

مختلف

اردو شاعری میں بہت ہی حساس جذیوں کا پیش بہا اضافہ ہے،
جن کے چے اور بر ملا اظہار نے لفظوں کو تو قیر بخشی ہے۔

سنگ میل
پبلی کیشنز لاہور

عہدِ یوسفی اور یوگن ویلیا کی چھاؤں

علی منور مدیم

یہ سنی صاحب نے عہدِ یوسفی کی ہر ذرا کی ایک ایک کر کے گواہی ہے، اب تک قرب قیامت کی نشانیں کی پانچ صدیوں تکلف ناموں سے ظہور میں آچکی ہیں، بلکہ باقاعدہ چمکنے کاغذ پر شائع بھی ہو چکی ہیں، ہو سکتا ہے یوسفی صاحب اب ہمیشہ نشانی کی چوڑی میں لگے ہوں وہ اپنے دور میں، نیا کو "عہدِ یوسفی" تک لے آئے ہیں لگتا ہے اپنی تحریروں سے جیتے کی قیامت بھی لا کر چھوڑ دیں گے۔

یہ سنی صاحب کو پڑھانے والی کے ہر دور میں پڑھا ہے یا شیخ امیر گن کا وہ زمانہ جب نصاب میں غلطوہ غالب اور میر کے لہجوں کی بازی والے افکار پڑنے لہنے کے بعد کچھ مزید اڑتوں میں پڑنے کا جی کر رہا تو گن کی حدود پھاڑ کر نکل بھاگنے والوں کی طرح ہم سعادت حسن منٹو، محبت چغتائی کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کی طرف پلٹے۔

خاص کر میر اور ناکامی کے معاشراتی و ادبی عشق کا وہ حصہ جو دو گھڑت باہر نکالتے ہیں، پڑھنے لکھنے والے ہمارے پڑھنے کے بعد یہ سوچ کر رکھ دیجئے کہ گھر کے درگاہ کچھ لیس گئے تو جہاں آئے نہ آئے قیامت ضرور آجائے گی۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن کی اجازت آج کے پاکستان کے جہانوں کے مطابق صرف وہ لوگوں کو ملے گا جو مطلب ہے۔ بالغ افراد کو ملے گا، جو ان میں پڑھنے والی کتابوں کو اٹھایا، میر اور ناکامی کے کرداروں کا اپنے اطراف کے کرداروں سے موازنہ کیا تو دو چار جملوں بعد ہی یہ سوچ کر کتاب بند کر دی ان کتابوں میں جو حکمت ہے اس کو سمجھنے بندھ گئے تو جہاں کے مثنوی شاعر کا گیارہ سارا سزا کر آ رہا ہو جائے گا، اپنے اطراف کے زندہ کرداروں سے لطف لے لیں، یوسفی صاحب کی کتابیں تو بعد میں بھی پڑھ لیں گے، کیونکہ یوسفی صاحب کی تحریروں میں اسے ہر ایک کتابت ہیں، انہیں سکون سے پڑھنا چاہیے، یہ کتابیں، انہیں قلم دار کی عمر میں پہنچے پڑھنا میر کی اس عمر میں ان سے محظوظ بھی ہو لیں گے اور ماقبت بھی سنواریں گے لیکن اب یوسفی صاحب کی کتابیں پڑھنے نہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کو پڑھنے کا یہ سب کا کردار کیا، ان کتابوں کو پڑھنے کا لطف اور ثواب تو گن یا جہاں میں تھا، اسے دیر ہو گئی ان کتابوں میں جن برائیوں سے پرہیز کرنے کا کیا تھا، وہ سب ہم سے ہر دور ہو چکی ہیں اور اب تک چھٹی ماقبت یوسفی صاحب کی کتابیں پڑھ کر دہا ہو چکی ہے وہ پڑھ کر وہ چار دن میں سنواریں سے رہی، دکاش ہم نے یہ کتابیں بہت پہلے پڑھی تھیں تو اس عمر میں ماقبت سنواریں کیلئے نیک کاموں کے کرنے کی حاجت نہیں ہوتی، اس طرح ہمیں قاعدہ یہ ہوا ہے ماقبت سنواریں ہوتی تھیں یہ اور نہ پوری طرح بگڑی ہوئی لگتی ہے، لگتا ہے وہ دینی جہان کی بھی عام یا کتابوں کی طرح نام نہاد نرخی میں گئے کی، انہوں نے پاکستانیوں کے احوال کا ثواب و ندامت اور یوم حساب کا فیصلہ تو دلان لگی ہو ہو کر پڑھ لیا ہے، ہم بھی عام مہربان، ان کی طرح نہ جنت کے رہے، نہ دوزخ کے رہے، کام، دوزخ کے جہنم جنت کی، نتیجہ تو صاف اور ہے۔

نوٹ: یہ مضمون ماہِ ربیعِ ذوقِ نوبارک کی ایک تحقیر کی نشست میں پڑھا گیا تھا اس پر شرکائے نشست کے تیسرے اور تحقیر حلقے کے چالیس ریلیز میں قارئین تک پہنچ چکے ہیں، اب میر اس مضمون کے بارے میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں ہے مجھے وہ باتیں عرض کرنی ہیں، اس مضمون پر حلقے کے شرکاء نے کافی قیصری تحقیر کی اور میں اس کیلئے ان کا محظوظ ہوں، دوسری بات یہ کہ اس مضمون میں جو بات بیان کرنے کی کو خوشی کی گئی ہے وہ بات قربانوں نے پچانوے فیصد اردو لوگ کے طرز و مزاج پر بھی صادق آتی ہے جاگیر دارانہ اور دہریہ الہا نے محض اشرافیہ کے نظریں ملے کیلئے تحقیقات کی ہیں اور معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کا کام نہ کر رہے، مزاحیہ لوگ سے لیا جانا چاہیے اسے بہت کم مزاح نگاروں نے اہمیت دی ہے، اس مضمون کی روح اسی نکتے کا اظہار کیا۔

کتابیں ہمیں طرح کی ہوتی ہیں، گن میں پڑھنے والی جہاں میں پڑھنے والی اور نصاب میں پڑھنے والی، گن میں پڑھنے والی کتابوں کو دلوں سے چھپ چھپ کر پڑھا جاتا ہے، جہاں میں پڑھنے والی کتابیں کتابوں میں دیکھ کر، کر رہے گھر کے پڑھتی جاتی ہیں، نصاب میں پڑھنے والی کتابوں کا سارا اظہار آواز و انداز قرأت سے پڑھنے میں ہوتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے وقت فوائد ہیں، گن میں پڑھنے والی کتابوں کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ استخوانوں میں لٹل ہونے کے کام آتی ہیں، استخوانوں میں مستقل شکل دینے والے پتے مٹل زندگی میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں، جہاں میں پڑھنے والی کتابیں ماقبت غراب کرنے کے اور نصاب میں پڑھنے والی کتابیں غراب کی لگی ماقبت سنواریں کیلئے ہوتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے جہاں میں ماقبت غراب نہ کر لی گئی ہو تو پھر نصابیے کیلئے ہو جاتا ہے، نصاب میں پڑھنے کیلئے کچھ بھی نہیں جاتا۔

اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی کتابیں زندگی کے تیزوں اور گن میں پڑھنے والی اور نصاب میں پڑھنے والی جانتی ہیں، ہر دور میں یکساں فائدہ دیتی ہیں اور گن میں پڑھنے والی ایک ہی تاثر دیتی ہیں، پڑھ کر نہ لگتا کہ ہر دور میں وہ نصابی اور ماقبت غراب کی چا لکتی ہے، مشتاق احمد یوسفی موجودہ عہد کے بہت سے مزاح نگار ہیں، ان کا لہجہ طبعی مزاح پر مبنی تھا اس طرح کہتے ہیں کہ کس نام مزاح کے عہد یوسفی "میں رہ رہے ہیں، اس بات سے تو ہمیں بھی اتفاق ہے کہ ان لوگوں ہم "عہدِ یوسفی" میں رہ رہے ہیں، ان لوگوں نے بتایا ہے کہ قرب قیامت کی نشانیں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ عہد احمد ہو گا، حالانکہ کسی نے یہ نہیں دیکھا تھا اس عہد کا نام "عہدِ یوسفی" ہو گا، یوسفی صاحب کی کتابیں اور تحریروں پڑھ کر ان کا انداز ضرور کیا جاسکتا ہے یہ عہد نکتہ غراب ہو گا، نصابی کتابیں غراب ہونے سے نہیں بڑھ، عہد غراب ہونے سے ہے۔ یوسفی صاحب کی ہر تحریر قرب قیامت کی نشانی

ہوئے ہولند اہل دینی خدا ان ملکوں کے عوام میں مشہور و مرغوب کر دیں چاہیے، کوئی تو صحت طلب چتر تیسری دنیا کے عوام کو بھی ملے۔

یو سنی صاحب کے مزاج سے لطف لینے کیلئے زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔
 وہ لوگ جن کا وہ مخصوص مزاج ہو اور وہ کچھ ہو وہ اپنے طور پر لطف لیتے ہیں۔ ہم نے
 یو سنی صاحب کے طرز مزاج سے لطف لینے کا یہ طریقہ کیا ہوا ہے کہ یو سنی صاحب کی
 کتاب سے چار پانچ صفحات پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کسی عام سے غیر معیاری مزاج نگار کا
 ایک صفحہ غور سے جان کر کے بہت ہنستے ہیں۔ ہمارے علاوہ ہماری کلاس کے اکثر عوام الناس
 بھی یہی کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ یو سنی صاحب کو پڑھتے کاسب سے
 چھٹا طریقہ یہ ہے کہ فیروز اللغات یا نور اللغات سے کچھ جملے اور پہلے تمام مترجم اور
 غیر مانوس الفاظ کی ایک فہرست بنا کر تیار رکھی جائے، یو سنی صاحب کو پڑھتے جائیں،
 فہرست سے معنی دیکھتے جائیں، کھٹکھٹا کر ہنستے جائیں۔ ہمارے اس دوست نے اپنی طالب
 علمی کے زمانے میں سارے امتحانات میں اسی تکنیک سے کامیابی حاصل کی ہے۔ ہم نے
 اپنے دوست سے کہا تمہارا ادب پڑھنے کا انداز جاگیردارانہ طرز تعلیم میں نصاب کی کتاب
 پڑھنے جیسا ہی لگتا ہے۔ تم کھٹکھٹا کر ہنسنے کا سر ٹیٹھ کیٹھتہ کہتے ہو حق نہیں کہتے۔ ادب
 عالیہ کے ہنسنے اہم موضوعات ہو سکتے تھے، یو سنی صاحب ان سب پر طبع آزمائی فرما چکے
 ہیں، مثلاً مرغیہا، یاد پتی، سنگریٹ، دھار، کتھ، کرکٹ، کافی چائے، چار پائی وغیرہ
 وغیرہ۔ ہم نے ان موضوعات کو ادب عالیہ کے موضوعات اس لئے کہا ہے کہ ہمارا ادب
 ان ٹیمیں ہمارے معاشرہ و الناس پر چند موضوعات کے گرد گردش کر رہا ہے۔ ہمارا ادب آج تک
 اس سے باہر نہیں نکل سکا۔ ہمارے ادب عالیہ میں استحصال، فحشیت، بھوک، سادگی
 انسانی، طبقاتی تفاوت، جیسے موضوعات پر لکھنے کی ممانعت ہے اس سے بھجان قلب والی
 کلاس پر اس پر اس ہو جاتی ہے۔ بھجان قلب کے پسندیدہ موضوعات وہی ہیں جن موضوعات
 عالیہ پر یو سنی صاحب نے لکھا ہے وہ ادب نکمے ہے۔ اتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ مزید لکھنے
 کی گنجائش نہیں بھڑکی۔ یو سنی صاحب کی معلومات بھی ان موضوعات پر بہت وسیع ہیں۔
 مثال کے طور پر دو کتوں اور ان کی اعلیٰ نسلوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں کہ ہم جیسے
 لوگ اپنے ہاں کے مقتدر ہیتے کی ذات اور یوں اور خاندانوں کے بارے میں نہیں جانتے۔
 یو سنی صاحب کے بعد ادب عالیہ کے ان اہم موضوعات پر لکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔
 ہمیں تو یہ حقیقت دل سے تسلیم ہے کہ ”سینئر“ اور ”مائیٹری“ کا انسانی معاشرے میں اپنی
 جگہ ایک مقام ہے اور یو سنی صاحب کے قلم سے ان کلابان ہونے کے بعد تو تمنا ہوتی ہے
 کہ ہمارا ادب سینئر جیسا کیوں نہ ہو اور فیض موسیقی کے اندر کسی دوسرے صاحب کے در پر
 آکن و لیلیا کی پہلک میں پڑے ہوتے تو آج کے اشرافیہ ادب میں ہمارا نام بھی لادوال ہو تا
 اور ہم بھی صد یو سنی کا حصہ شہر ہوتے۔ نہ انتقادات کہیں اور نہ کی باتوں سے آپ یہ نہ سوچ
 رہے ہوں کہ ہم مصنف یو سنی صاحب کی تحریروں کے مدافع نہیں ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں
 ہے۔ ہم بنیاد مشترک یو سنی کے یہ مدافع ہیں جس اختلاف اتفاق ہے کہ مزاج کا فرق
 سادگی و ہمدردی اور انسانی ہے یہی اختلافی شامی کا فرق بھی ہے ہم میں نہی یہ رہی ہے
 کہ ہر انسان نہ فیض کی شاعری پڑھ کر آج تک باقی یا انسانی ہوا ہے نہ یو سنی صاحب کی
 تحریریں پڑھ کر انہم میں کوئی سماج سدھار جذبہ انگیزائی لے کر اٹھا ہے۔ مگر ہم دونوں کے
 یکساں ہونے ہیں۔ یہ تحریریں خوب بہت خوب ہیں اور ہم نے ان تحریروں کو لطف
 لینے کی نظر سے دیکھا ہے۔ لطف لے لے کر پڑھا ہے ہمارا لطف لیا ہے۔

[illegible]

معلق ہاں اٹھائے سڑک پر گھنٹے پائی کے گڑبے میں جا کر گرے، اس پرپ سڑک کو دیکھ کر ایک ایسا مزاج تحریر کیا جاسکتا ہے۔ عام مزاج نگار اس منظر پر کئی خوب صورت بیانیے اور بہت ایسا مزاجیہ مزاج تحریر کر سکتا ہے مگر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کیا اس منظر میں موضوع کرتے والے کو بنایا جائے یا گرنے کے سبب کہہ دیا جائے، اس منظر میں ظریفی کا سبب اور اس کا تقاریر دونوں موجود ہیں، مگر نے والا فقیر ہے۔ سڑک پر کیلے کا پھلکا پھینکا اور سڑک پر گھنٹے پائی کا گڑھا اور بے فلاحی کی نشان دہی کرتے ہیں ناظر مزاج نگار کرتے والے پر جیسے ہیں، فلاح اور معاشرے کی ظرایاں نظر انداز کر جاتے ہیں، دکاش مزاجیہ اوپ کرتے والے پر نہیں کرتے والے کے بارے میں تعلق ہو تا تو ہم آج اپنے مگر زبان میں وہ والے شرمندہ ہوتے۔ ہمارے مزاج نگاروں نے اپنے مزاج سے دو کام نہیں لیا، فقیرانہ زبانی اور زبان کیے ہوئے لکھنے والے خبر و مزاج نگاروں کو دھن سوخت اور سر دینے کے اپنے معاشرے کی اجتماعی بافقیت کی علامت بنی کیسے ظہر و مزاج نگاری سے بچاتے۔ میں یہ کئی صاحب کی تخلیقی صلاحیت یا محنت کے سورج کو پانچ دھکاتے کی کہ خشک نہیں کہہ سکتا ہوں۔ یہ کئی صاحب پر بات کرتے ہوئے کوئی بھی شخص خود اپنی عزت افزائی یا ہر ذرا جتنی کر رہا ہو تا ہے۔ بلاشبہ صرف اردو ادب کے لحاظ یہ مزاجیہ کو سب کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نگار ایہ اور مزاج کے معاملے میں مشتاقی یا کئی صاحب کا دور ہے اور آج ہم مزاج کے عہد پر کئی ہیں، دور ہے ہیں مگر تخلیقی یہ محسوس ہوتی ہے کہ اتحاد مزاج نگار انکار کا اور ایمان اور سب آکر اپنی کاروں سے خود کو دیکھ کر کاجی نا افسانہ نگاری کے موضوعات سے سرفراز نگہ کر جائے تو مجھ جیسے لکھنے والے کو موتی اعتبار سے دھن دیا کی پیمائش میں خاموش بننے ہوئے ہیں۔ عہد پر کئی کی تحریروں اور تریب کو لکھتے ہو کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

نمای _____ علامه اقبال

غذاب سہ کے بھی آو و فغاں نہیں کرتے
کسی سے حال دل اپنا بیان نہیں کرتے
ہم احتجاج کے فن سے تو خوب واقف ہیں
لگنا لگنا آسمان نہیں کرتے
(۱۱) لکڑی صبیحہ صبا

جانے والے بھی نہیں آتے



یہ تراشہر بھی بے شہر زلیخا جان
وہ پیسیر ہے جو دامن کو بچالے جائے

شاعر، ادیب اور میڈیا

جوہر میر

مغفل ہوتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ہمارے بزرگ اور عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب نہ صرف اپنے دیوان کی اشاعت کے متعلق رہے بلکہ انھوں اور انھیں میں بجائے جانے کی خواہش سے بھی مغلوب رہے۔ سوڈین ۱۹۷۰ء میں ہندوستان میں پرنٹ میڈیا ریاست جو چکا تھا۔ کتابوں کے قلمی نسخے بھی تیار کرانے کا رولن تو تھا ہی اشاعتی ادارے بھی اس عہد میں کام کرنے لگے تھے۔ یہ جان کر ہمیں حیرت نہیں ہوتی کہ غالب جیسے عظیم شاعر نے اپنے دیوان کی اشاعت کیلئے خود کسی خوشنویس کی خدمات کیوں حاصل کیں۔ اپنی جیب سے خوشنویس کو اس کی محنت کی اجرت کیوں ادا کی؟ اور یہ کہ وہ اپنے ہر دوست سے اپنے دیوان کی اشاعت کے بعد ہمت کا سوال کیوں کرتے رہے؟ ہمیں اس بات پر بھی حیرت نہیں ہوتی کہ اس دور میں بعض نامی گرامی دانشوروں نے دیوان غالب کی اشاعت سے کیوں انکار کر دیا تھا؟ ظاہر ہے ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں اس دور میں غالب کے شاعرانہ مقام کا تعین نہیں ہوا تھا۔ مرزا غالب اپنے مقام و مرتبے سے آگاہ تھے اور اسی بنا پر دوچاہتے تھے کہ ان کا کلام رائج الوقت ذرائع ابلاغ کی وساطت سے عوام الناس تک پہنچے، اس عہد میں کسی شاعر کی شہرت کی شرائط یہ تھیں کہ اسے مغل دربار کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔ اس کا کلام انھوں کو گھوٹا پر گھایا جائے گا۔ ان کا کلام ہتھکڑی گھوٹوں میں گائیں اور اس کا دیوان چھپ جائے۔ قبولیت اور شہرت کی شرائط کم و بیش آج بھی یہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی معیار اور کسی بھی طرز کا میڈیا کسی بھی تخلیق کار کی بہت سی اہم ضرورت رہا ہے۔ مرزا غالب نے جب اپنے عہد کی ناسپاسی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ :-

شہرت شعرم بیگنی بعد من خواہد شدن

یعنی میرے شعر کو آنے والے زمانے میں شہرت ملے گی تو اس کا بہت سادہ سا مفہوم یہی ہے کہ انہیں مستقبل کے اظہار و ابلاغ کا بہت اعلیٰ شعور تھا۔ یہ روایت (جو ان کی زندگی پر مبنی تھی) قلم سے ملی ہے، اگر درست ہے کہ وہ نواب جان کے گوشے پر اپنی غزلیں پہنچانے کیلئے خود تقریباً لے گئے تھے تو اس بات سے بھی ان کے مقام و مرتبے میں کمی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں ان کی اس کوشش نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مغل دربار سے ملنے والی شہرت، گوشے سے ملنے والی شہرت کے مقابلے میں بیچ نظر آتی ہے۔ مغل دربار سے ان کی وابستگی ان کی معاشی مجبور تھی، ان کی شعری مجبوری نہ تھی جبکہ انھوں اور انھیں میں گائے جانے کی ضرورت ظاہر غیر معاشی ہونے کے باوجود شہرت کے حوالے سے ان کے دیوان کی اشاعت اور مقبولیت کی ضرورت کے تابع نظر آتی ہے۔ بلاشبہ غالب کو گوشے اور گھوٹوں میں نہ گائے جانے اور مغل دربار میں نہ پڑائی نہ پانے کے

تخلیق ابوب علی نہیں، زندگی کے کسی بھی شعبے میں ریڈیو، ٹی وی، فلم اور پرنٹ میڈیا کا کردار بہت ہی اہم نظر آتا ہے۔ سماجی ترقی نے جہاں مواصلاتی ذرائع کو فراوان اور سہل بنا دیا ہے وہاں کسی ادیب اور شاعر کیلئے جدید اظہار و ابلاغ کے وسائل اور ذرائع کو ناگزیر بنائے دیے ہیں، کوئی تخلیق کار کتابی ذرائع ابلاغ کیوں نہ تخلیق کر رہا ہو اس کی عظمت کا تعین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ رائج الوقت ذرائع ابلاغ سے مستفید نہ ہو، تخلیقی عمل کی اصل غایت بھی یہی ہے کہ شاعر اور ادیب یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں خصوصاً کروڑوں افراد کو اپنے خیالات کو اپنی شخص، اپنی تحقیق اور تخلیق عوام تک پہنچائے، اس غایت کی تکمیل کے بعد ہی کسی تخلیق کے حسن، حق کا تعین ممکن ہو سکتا ہے اور یہ پتہ چل سکتا ہے کہ عصری ادیب میں کون کون تخلیق کر رہا ہے اور اس کی تخلیقات کا کیا معیار ہے۔ اس اصول کا اطلاق دنیا کے ہر معاشرے اور ہر زبان کے ادیب اور لایچل پر ہوتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کی دریافت سے پہلے بھی اظہار و ابلاغ کے ذرائع موجود تھے، اگر موجود نہ ہوتے تو دنیا کا عظیم ادیب جس نے ہمارے آئین کے تخلیقی ادیب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، موجود نہ ہوتا۔ ستر لاکھ کی علمی مجالس میں کسی بحث کو عقیدہ کرنے کا رول نہ تھا، وہ انسانی ذہن کی تفکیر میں مصروف تھا لیکن افلاطون نے اپنے استاد کے خیالات کو قلبیہ طور کے مستقبل کیلئے گراں قدر علمی ذخائر چھوڑے۔ فوراً کیا جائے تو ستر لاکھ اس سے پہلے کے افلاطونی فلسفیوں کی کاوشیں اگر مخطوطات کی شکل میں ہم تک نہ پہنچیں تو پوری دنیا انسانی ذہن کے ارتقاء کے بہت سی اہم عہد کے ادراک سے محروم رہ جاتی، ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ افلاطون نے اپنے عہد میں کن ”پیشروں اور دانشوروں“ کی خدمات حاصل کی تھیں مگر یہ مان لینے میں ہمیں کوئی حرج نہر نہیں آتا کہ لکھے ہوئے حروف کی تشہیر کا کوئی ذریعہ اس دور میں ضرور موجود ہو گا۔ جس نے آئے والے زمانوں کیلئے مختصر میں مرتب کئے گئے اصلاتی قلم سے مستفید ہونا ممکن بنادیا تھا۔ باہل، نیچر کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصری الی پٹلا ایسا حکمران تھا جس نے ایک تحریری آئین چھوڑا تھا، یہ تحریری آئین کاغذ کی ایجاد سے پہلے تحریر کیا گیا۔ منی کی ٹھیکریوں پر نقش کر کے بھٹی میں ڈھالا گیا تھا، اس قلم کا مقصد بھی وہی تھا جو افلاطون اور اس کے معاصرین کا تھا۔ مصری تمدن بھی اسی ارتقائی عمل سے گزری اور باقی دنیائی طرح و نمونہ پاک و ہند میں بھی تمدنیں ارتقاء کے مراحل اسی طرح طے ہوئے ہیں۔

یہ تخلیق ہی ہوتی ہے جو اپنے مائل کو مادہ سے تعارف کراتی ہے لیکن تخلیق خود کسی نہ کسی ذریعہ ابلاغ کی محتاج ہوتی ہے۔ صوتی اور بصری دونوں طرح کی تخلیقات کسی نہ کسی ذریعہ تشہیر کی محتاج ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم بھی نظر آتی ہیں، لکھا ہوا ادیب اور سامعین کے علاوہ وہی مصری استعداد کے ذریعے بھی ہمارے ذہنوں میں

بلوچوں کے شاعر ہوتے، ان کی عظمت میں کمی نہ ہوتی مگر وہ ایک گناہ عظیم شاعر ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل میں ایسے کتنے عظیم تخلیق کار گناہیوں میں دفن ہو گئے ہیں جو اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے مستفید نہ ہو سکے تھے۔ یہ مان لینا ہر حال مشکل ہے کہ انسانی معاشرے کے عہد و تحذیبی عہد میں کوئی ذریعہ ابلاغ نہ تھا۔ ہوائی لکھی ہو گا کہ پیاسا دریا تنگ نہ پہنچ سکا ہو گا۔ دریا تو کسی زمانے میں بھی پیاسوں تک نہیں پہنچا۔ اس اعتبار سے ہم کسی بھی تخلیقی عمل کی شہرت اور بقاء کے حوالے سے کسی بھی قسم کے میڈیا کو ادیب اور شاعری شہرت اور بقاء کیلئے ناگزیر سمجھیں تو اس میں کسی ادیب اور شاعر کی توہین کا کوئی پہلو نہ ہو گا۔ آج کے دور میں تو شہرت اور بقاء کا یہ معاملہ محض ادیبوں اور شاعروں کیلئے بھلا بھلا کا درجہ رکھتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اب اظہار ابلاغ کے نئے شہرت دینے کے علاوہ تخلیقات کا معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو جن شاعروں کا کلام نشر کرتا ہے وہ اچھے شاعروں کی شہرت میں اضافے کے علاوہ ان کے مجموعہ کلام کی فروخت میں اضافے کے امکانات بھی پیدا کرتا ہے۔ اچھے ادیب کی اشاعت میں بھی یہی اصول کار فرما ہے۔ کوئی شاعر یا ادیب اگر کسی اوقی پرپے میں اپنی کوئی تخلیقی اشاعت کیلئے بھجواتا ہے تو اس کا مطلب اپنے تخلیقی ادیب میں دوسروں کو شریک کرنے کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عصر میں موجود نظر آئے۔ اسی طرح اگر کوئی نہ بری یا بلیشر اچھے ادیبوں اور شاعروں کا کلام اور ادیب کو شائع کرتا ہے تو اس کی اس خدمت کوئی سبیل اللہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کی اس خدمت میں شعر و ادب کی خدمت کے جذبے کے علاوہ اس کی معاشی بقاء کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ (پاکستان میں لولی جرائم کے مسائل اور ان کی مشکلات سے قطع نظر)۔

اس تنہید کا پس منظر یہ ان شب کی ایک گفتگو ہے جس میں کراچی کے ایک معروف شاعر جناب سلیم کوثر کی شاعری زیر بحث تھی۔ ان کا مجموعہ ”یہ چراغ ہے تو ہمارا ہے“ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ سبھی ان کی شاعری کی ستائش کر رہے تھے مگر ایک سوال بھی کی زبان پر تھا کہ اتنا اچھا شاعر گناہ کیوں کر رو گیا؟ انہیں وہ شہرت کیوں نہ مل سکی جو ان سے کم درجے کے بعض اچھے شعراء کو حاصل ہو چکی تھی؟ اس سوال کا جواب دراصل شاعر کے اپنے لکھے ہوئے ایک اظہار ہے جس میں موجود تھا۔ اس اظہار ہے کے مطالعے سے پتہ چلا کہ سلیم کوثر نے اپنی ”گناہی“ کی ذمہ داری اپنے سواہر شخص پر ڈال رکھی تھی وہ اپنی شاعری سے تو بے حد مطمئن تھے مگر ان حالات سے گلہ مند تھے جو ان کی دانست میں ان کی شہرت اور ان کے عروج کی راہ میں حائل تھے۔ زمانے کی ناقدری کا رد کرتے ہوئے خود تو تصدیق کے جذبے سے مضطرب ہو کر انہوں نے اپنے اظہار میں جگہ جگہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ ان کی راہ میں ان کے علاوہ اور کوئی حائل نہیں رہا۔ لہذا یہ کہ اپنی تمام تر شاعرانہ خود اعتمادی کے باوجود وہ اپنے زمانے کے عملی تقاضوں کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ اگلے لوٹ آئے وہ کہہ اگر وہ انہوں کے غالب کو اپنی عظمت و اعزاز کو ان کیلئے ٹھکڑا بنا کر اقبال شریب کا شاگ فریڈ نے کیلئے میر تقی میر بھی بنا دیا تھا۔ اور دوسری کے گوشے پر تو جانا ہی پڑا تھا کہ غالب کے عہد کے عملی تقاضے کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس دور میں اگر ریڈیو، ٹی وی اور بھلا ہو چکے ہوتے تو یقیناً غالب ریڈیو ٹی وی کو مغل دربار پر ترجیح دیتے۔ غالب کو اس کے عہد کے بہت ہی محدود سے دائرے سے نکل کر وہ ام حاصل کرنے میں اگر اپنے عہد ہی میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اپنی کئی دوسری کمزوریوں کے باوجود وہ ایک عملی آدمی تھے اور اپنے مقام کو منوانے کیلئے بہت شجیعہ تھے۔ ان کے برعکس سلیم کوثر اور ہمارے بہت سے دیگر عہد شاعر اگر بہت کچھ اپنے کے باوجود شہرت کے آسمان پر روشن نظر نہیں آ رہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

مذہب جالندھری مرحوم نے اگر یہ کہا ہے کہ ”لوہی مشکل سے منوایا گیا ہوں“ تو لفظ نہیں گناہ تھا۔

اپنے اظہار ہے میں اپنی شاعری کی پذیرائی کے دعوے کے ساتھ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ”1981ء سے اب تک اس مجموعہ کو کسی بھی بیوروہ کرینٹ شاعر کی پی آر سے تولد ہونے والی شہرت سے زیادہ پڑھے جانے کا شرف حاصل ہے۔ یہ ادیب کے وہ ”پلاٹنگ السر“ ہیں جو آپ کو تائیس کے کہ اعلیٰ درجے ادب کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ کیا واقعی اردو شاعری کے پلاٹنگ السر ہیں؟ شاید ایسا ہی ہے۔ سو بہت سے لوگ ان کی بیسٹنٹ چنہ گئے۔ یہ جنگ (شہرت کے حصول کی جنگ، خود کو تسلیم کرانے کی جنگ) لڑتے لڑتے میر اور نوحہ نگاروں کے گڑے ہو جانے لگا، میں بھی بچ نہ خاک اور جلاں کا اور پھر۔۔۔ پھر وطن پرستی کا فتنہ کسی اور کے سینے پر سجا دیا جائے گا۔“ جن چند جملوں میں سلیم کوثر ایک طرف تو اپنی پذیرائی کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اپنی محرومی کے اعتراف کی اظہار فراہم کرتے ہیں۔ وہ کسی اور سے زیادہ اپنے آپ کو اپنے مقام اور اپنی مقبولیت کا قائل کرتے نظر آتے ہیں، مگر قائل نہیں کر پاتے اور نامر لولی کے عالم میں اپنے گڑے گڑے ہو جانے اور دفن کر دیے جانے کے علاوہ وطن پرستی کے قنفے سے محروم رہ جانے کی بھارت دیتے ہیں۔ اسی اظہار ہے کے ایک اور جگہ اگر ان میں اسی نوجے کو وہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ”میری جنگ زیادہ شدید ہے، میرے پاس کوئی دوا عہدہ نہیں جس سے مزعوب ہو کر میری شاعری کو سراہا جائے سکے اور بلا شہرت غیرے ان عہد کے تمام مثبت تنقیدی رویوں کو میرے نام لکھ دیا جائے کہ ادیب میں غیر جانبدارانہ عہد اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میرا تعلق ایسے ”ترقی پسندوں“ سے بھی نہیں جن کی ایئر کنڈیشنڈ کاروں کیلئے بھوک اور انساں سے بے حال لوگوں کی گلیاں اور محلے تنگ پڑ جاتے ہوں اور جو کشادہ سڑکوں سے گزرتے ہوئے ترقی پسندی کے الہام میں جھٹکا ہوں۔ جو مزدور کے پیسے میں مار کسی نظر یہ کا ابلاغ تلاشے ہوں۔ میں کوئی سرمایہ دار بھی نہیں کہ ادیب کے پلاٹنگ السروں کی خواہشوں کو جدید مسوئیتیں فراہم کر کے اپنے حق میں دم توڑتا ہوا فیصلہ لکھواؤں۔“ (نومبر 1986ء میں لکھے ہوئے اس اظہار ہے میں ”نثری شاعری“ کے انداز کے اس نوت میں ایک عہد اور بلیغ شاعر اپنے خلاف جنگ لڑتے ہوئے شہادت کا درجہ حاصل کرنے کا خواہش نظر آتا ہے۔ وہ ہار یا جنگ اور شدید جنگ کی خبر دیتا ہے۔ وہ ہار یا جنگ کا انہوں کی نشاندہی کرتا ہے مگر وہ کبھی بھلائی رکھنا ان کے خلاف لڑنے کیلئے تیار نہیں، ہمیں نہیں معلوم جناب سلیم کوثر نے جن پلاٹنگ السروں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کون تھے، مظاہر ان کا اشارہ میڈیا کے ادیب مسد و کشادہ کی طرف ہوتا چاہیے۔ سو اگر ان کی تنقید کا ہدف درست بھی ہو تب بھی ہمیں اس بات کا قائل تو ہونا ہی پڑتا ہے کہ ایک تخلیق کار کیلئے اپنے عہد کے میڈیے تنگ رسائی اس قدر اہمیت کی حامل ہے۔

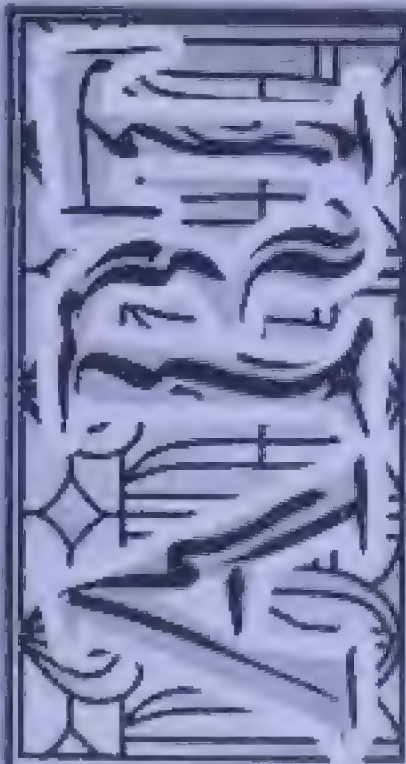
تخلیقی عمل کے تقاضوں سے عہد و آہو جانے کے بعد کسی تخلیق کار کا احساس محرومی دراصل اس ضرورت کا حامل ہے کہ تخلیق کار رائج الوقت دستور پذیرائی کو مسترد نہ کرے۔ وہ اپنی ان کو اپنے قد وقامت سے تمہار نہ کرنے دے تاکہ کسی کو اس کے مقام کا تعین کرتے ہوئے مشکل پیش نہ آئے۔ پاکستان میں ایسے بہت سے شعراء اور ایسے بہت سے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے جو اپنے تخلیقی مرتبے میں جناب سلیم کوثر یا کسی بھی گناہ ”معروف“ شاعر اور ادیب سے کم مرتبہ ہونے کے باوجود زیادہ شہرت پانے میں کامیاب ہوئے۔ پانچویں دہائی کی ابتدا تک تو ہمارے بہت سے لڑاؤم شاعر جناب فیض احمد فیض بھی شہرت کے اس مقام پر فائز نہ تھے جو ان کو معدی حسن کی

میں کالم نویسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ بعض اوقات جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ سیاسی تعصبات پر مبنی ہوتے ہیں جو سرکاری یا تعلیمی ادارے کے کسی ملازم کیلئے نامناسب ہونے چاہئیں۔ اپنی کالم نویسی کے ذریعے وہ ”پیدا“ کے کئی اور دائرے پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ نیاہ الحق کے پاکستان پر قبضے کے فوراً بعد فی وی پر اشفاق احمد اور سلیم احمد کے تسلط کی مثال دہر آنے ایک تعلیمی ادارے کے ملازم کا کالم نگاری کے توسط سے سفارتی ملازمت حاصل کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مقابلے کی دوڑ میں شاعر اور ادیب کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے چند ماہ پہلے کے اقتدار میں ظفر اقبال نامی شاعر کا اردو ساقتس بورڈ کا سربراہ مقرر کیا جانا بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ تھا۔ اپنی تقرری کے بعد گریڈ 21 کے حصول کیلئے جناب ظفر اقبال کا صدر نقاد کی تک پہنچنا ایک ”خداداد“یں ”نموشش“ تھا جس سے ہمیں مقالات کی اس جنگ کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ ایک اور نام نہاد صحافی حسین حقانی کا میاں نواز شریف اور محترمہ سبہ ظفر سے باری باری مستفید ہونا بھی ہنرمندی کی ایک کامیاب مثال ہے۔ مذہب ناجی نامی ایک جرنلسٹ کا پیپلز پارٹی کے اخبار کی ایڈیٹری سے لوٹنے وقت کی کالم نگاری تک استہانت ہونے کے بعد انڈی آف لیسر کا سربراہ بن جانا بھی چند لبقاء کی ایک مثال ہے اور اس کے خلاف احتجاج کا سیلاب بھی بہت دنوں کی محرومی کے حوالے سے قابل فہم ہے۔ آخری مثل دربار میں استاد ذوق اور اس کے شاگردوں کی طرف سے مرزا غالب کے خلاف مزاحمتی رقیہ مقالات کے اسی اصول پر مبنی نظر آتا ہے جو آج ایک بڑی حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ غالب کے زمانے میں اگر ثواب جان وسیلہ شہرت سمجھی گئی تھی تو آج ملک ترنم نور جہاں، طاہرہ سیدہ اقبال بانو، ممتاز، غلام علی، صدیقی، حسن اور ایسے ہی دوسرے گلوکاروں اور گلوکاروں تک رسائی حاصل کرنا کوئی عجیب بات نہیں۔ عجیب بات یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی راج الوقت دستور پڑنے والی کو نظر انداز کر کے ”حب الوطنی“ کا تہذیب حاصل کر لینے کا خواب دیکھے، جیسا کہ سلیم کوثر صاحب نے دیکھا تھا۔ شعر و ادب کے میدان کو میدان جنگ سمجھ کر اس میدان میں اترنے والے دراصل جنگ کے ایک بہت ہی شر و آفاق اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ یعنی Do or Die تم اگر اپنے دشمن کو نہیں مارو گے تو دشمن کے ہاتھوں مارے کیلئے تیار ہو چلو، نیک نامی اور گمنامی کی موت۔



گائی ہوئی غزل ”انکوں میں رنگ بھرے“ ”نور صفا کی گائی ہوئی“ ”مجھ سے پہلے ہی محبت“ کے منظر عام پر آنے کے بعد حاصل ہوا نقد کو لے لیتا کر سکتا ہے کہ کتاب احمد قرآن کو شعر تو ہی کے آسمان پر پہنچانے میں مینڈ پالا کر دیا کہ وہ ہاں ہے۔ غزل تو اپنے حمد کی شاعری میں منظر و مقام کے حامل تھے، لہذا انشاء کی شائستگی تو فن کے سطرانے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ فن کی شاعرانہ شہرت سے ہم استاد لائٹ علی مرحوم کی آواز کو کیسے الگ تھلگ سمجھ سکتے ہیں۔ کسوی پرہیزگار کے ایک لکھنؤ جناب عارف الشکار کب اور کیسے شاعر کہلائے؟ عارف الشکار نے تو اچھی بھلی غزل کہہ کر بھی دکھادی۔ ایسے لوگ بھی مینڈ پیجر کے درپیش نام شہرت پر گھڑے نظر آتے ہیں۔ جن کی شاعری پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو پرنٹ مینڈیا کی کنوینشن سے الیکٹرانک مینڈیا میں داخل ہوئے۔ اس فہرست میں ایسے کئی نام شامل کئے جاسکتے ہیں۔ جن میں ایک تو وہ ہیں جو اپنے شعری اور ادبی مقام کے تعین کے بعد مینڈیا کی توجہ عام کر گھرے ہوئے دوسرے وہ جو رائج الوقت دستور پڑنے والی سے انکس کی بناء پر گھر پیچھے۔ اس فہرست میں اگر وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن پر طوق زہریں ہمہ دورہ لگنا ضرورے تمام کا وہ جی تو نہ ہے تو اس میں نیا وہ تصور ان تخلیق کاروں کا ہے جو شہرت کی بے چارہ خواہش کے باوجود اپنی بناء سے اپنے آپ کو نام نہاد کر کے جس معروف وسیع ہیں، جو زندگی بھر اپنے آپ کو قائل کرتے رہے ہیں کہ ان کی ادب کوئی اور عالم ہے۔ منہم کوثر ہمارے اچھے شعر و ادب کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو حرفہ کی تشہیر کی اہمیت سے آگاہ ہونے کے باوجود محض اس دنیا پر مشغول نہ ہو سکے کہ ان میں اپنے آپ کو مٹانے کے بجائے بالقدح تو جو زندگی بھر اس وہم میں مبتلا رہے کہ ان کیلئے حضرت خضر آب حیات کی صراحتی نواہے کر آئیں گے، خواب کھانے کیلئے۔

ادب جب کہ شعر و ادب کی سرحد میں شوق و فہم سے چالکی ہیں، شاعر اور ادیب کیلئے الیکٹرانک مینڈیا کی قربت حاصل کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں جہاں معاشرہ بہت کمزور ہے وہاں مقالات کے تصانیف بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ سیاسی عدم اشکام اور نام نہادوں کی ممانعت اور مخالفت میں ”مستقیم“ اور شاعر سکھانے کیلئے قریب قریب اور اس قرب کو پیش کرنا جانا چھٹے ہیں نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے مخالف لابیوں اور شاعروں کو اپنی مناصب سے تعلق برائے اور دور رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ایسے روزانہ الخزانہ اور سید نے ایک اردو اور فارسی کی ایک فہرست جاری کی ہے کیلئے شاعری کی قریب قریب اور سید نے ایک اردو اور فارسی کی ایک فہرست جاری کی ہے



DESIGNING WORKS

For Assurance of International Professionalism in your work.

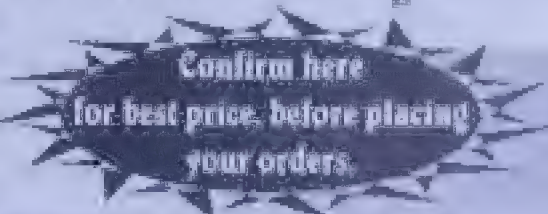
CONTACT For:

GRAPHIC DESIGNING

WEB PAGE DEVELOPMENT

URDU & ENGLISH COMPOSING

And All Printing Solutions



Tel: (718) 347-1582
Email: manzar.khushid@usmail.net

سب سے بہتر ریٹ۔ سب سے بہتر سروس

**FASTEST WAY TO SEND
MONEY TO PAKISTAN**

ادھر ڈالیں

ادھر روپے لیں

ZAR MONEY TRANSFER

دفاتر سے
آسانی کی
سہولت بھی
موجود ہے

زری طرانسفر

فری اوور نائٹ ہوم ڈیلیوری

پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ ملتان، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور جھنگ میں سروس حاضر ہے

**265 NEPTUNE AVENUE, (Btwn: Brighton 6 & 5)
BROOKLYN NY 11235**

Tel: 718-332-3300

Fax: 718-332-0692

PUNJAB

AUTO REPAIR &

BODY WORK

FOREIGN & DOMESTIC CARS

ONE WINDOW SERVICES

OPEN 24 HOURS

— All kinds of Auto Repairs

— NYC Inspection

— Auto Electrical Repair

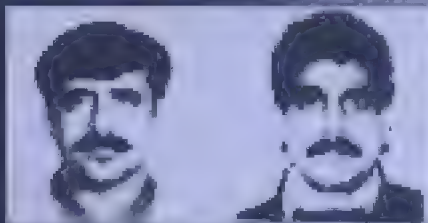
— Auto paint through Oven Spray

— Booth Technology

— Free Estimate

— Free Towing Service for
Collision Jobs

Contact:



Chaudhry Khizar & Chaudhry Akbar



گاڑیوں سے متعلقہ تمام

معاملات کا حل ایک ہی جگہ پر

گاڑی کا مکینکل گام کروانا ہو

یاباڈی ورک ہم سے رجوع کریں

33-56 21st Street, LIC, NY 11106

Tel: 718-728-4600

Fax: 718-728-5700

خوابی

احمد فراز

دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں
وہ کسی غولِ گریزاں میں ملا ہے سو کہاں

ہم نے مدت سے کوئی جھوٹا واسوخت کئی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کہاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کہاں

آنکھ اسی طور پرستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کہاں

بارہا کوچہ جاٹاں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی دلا ہے سو کہاں

جلوے دوست بھی دھندلا گیا آخر کو فراز
ورنہ کہنے کو تو غم، دل کی چلا ہے سو کہاں

نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس پرہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
دام دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تعافل کب تک؟
سکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یار بے فیض سے ہکا سا مال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروان رہ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ، پر یہ حقیقت ہے فراز
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اسے دل نہ رہے
ہم تو اب ترک تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزم مقتل جو بچے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے لہمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشہ رہزن کا امیر
کارواں نیست رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرف ممسری عطا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہے

سامنے ٹو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کہ مری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحب محفل وہی کہتا ہے فراز
کہ وہ اٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

افتخار نسیم

چاند پھر تاروں کی اجلی ریزگاری دے گیا
رات کو یہ بھیک کیسی خود بھکاری دے گیا

ٹانگتی پھرتی ہے کرنیں بادلوں کی شال پر
وہ ہوا کے ہاتھ میں گوشت سناری دے گیا

کر گیا ہے دل کو ہر اک داپے سے بے نیاز
روح کو لیکن عجب سی بے قراری دے گیا

شور کرتے ہیں پرندے بیڑ کٹا دیکھ کر
شہر کے دست ہوس میں کون آری دے گیا

کونکوں میں گیت اور ہرنوں میں آنکھیں بانٹ دیں
ناچتے موروں کو وہ خوش رنگ ساری دے گیا

اس نے گماں بھی کیا تو کیسے پتھر سے نسیم
پتوں کا تھنہ مجھے میرا شکاری دے گیا

خود کو جھوم دہر میں کھوتا پڑا مجھے
جیسے تھے لوگ ویسا ہی ہوتا پڑا مجھے

دشمن کو مرتے دیکھ کے لوگوں کے سامنے
دل نہیں رہا تھا آنکھ سے رونا پڑا مجھے

کچھ اس قدر تھے پھول زمیں پر کھلے ہوئے
تاروں کو آسمان میں ہوتا پڑا مجھے

ایسی ٹھکست تھی کہ کئی انگلیوں کے ساتھ
کانٹوں کا ایک بار پروتا پڑا مجھے

کاری نہیں تھا وار مگر ایک عمر تک
آب نمک سے زخم کو دھونا پڑا مجھے

آساں نہیں ہے لکھنا غم دل کی واردات
اپنا قلم لو میں ڈھونا پڑا مجھے

اتنی طویل و سرد شب بھر تھی نسیم
کتی ہی بار جاگنا سوتا پڑا مجھے

آساں پر پردہ اب رواں کوئی نہ ہو
اسے خدا ایک دن تو اپنے درمیاں کوئی نہ ہو

یا مرے دل سے مٹا دے دن گزر جانے کا خوف
یا زمیں وہ دے کہ جس پر آساں کوئی نہ ہو

طول دینا ہے کہانی کو تو خوشیاں یاد کر
داستان غم میں حرف رانگاں کوئی نہ ہو

پھول بچھ ہیں جزیروں کی طرف لہروں کے ہاتھ
کوئی ہو شاید وہاں پر بھی، جہاں کوئی نہ ہو

کیوں مرے سر پر ہی آئے یہ عتاب آفتاب
کیوں مرے جسے میں آخر ساہاں کوئی نہ ہو

آنکھ کو بھاتی نہیں یک رچی دیوار و در
اب تو ایسا شر ہو جس میں مکاں کوئی نہ ہو

آئیے گا ایک دن تو گھر سے باہر بھی نسیم
ڈھونڈیے گا اس کو بھی جس کا نشان کوئی نہ ہو

حلیم قریشی

اشرف میاں

ایسا لگتا ہے آرزو نہیں کچھ
سامنے تو ہے اور تو نہیں کچھ

بد گمانی کے زرد صحرا میں
میرے آنکھوں کی آب جو نہیں کچھ

تجھ پہ احوال کس طرح کھولیں
خالی آنکھوں میں اب ہو نہیں کچھ

جس کو رودادِ غم سنانی ہے
پاس بیٹھا ہے کشتگو نہیں کچھ

ایک دیوار تھی پرانی سی
اسے بنوں اب تو روبرو نہیں کچھ

دل کچھ ایسے حلیم چاک ہوا
صورت چارہ و رُو نہیں کچھ

میرے وطن ترے احساں بھی سنبھالے ہیں
ترے فراق نے اعصاب توڑ ڈالے ہیں

زمین ترس گئی پانی کے ایک قطرے کو
فلک پہ چھائے ہوئے ابر کتنے کالے ہیں

یہ فاصلہ کوئی صدیوں پہ تو محیط نہیں
شبِ سیاہ سے بس دو قدم اجالے ہیں

ہمیں پتہ ہے مگر مصلحت نے مار دیا
فصلی شہر میں جس نے شکاف ڈالے ہیں

پکارتے ہیں مدد کیلئے محافظ کو
یہ میرے شہر کے باسی بھی بھولے بھالے ہیں

شجر سروں پہ گھنے سایہ دار اگر ہوں گے
بہت سے لوگ ہمارے بھی ہمسفر ہوں گے

فقط ہمیں پہ نہیں ہے عذاب تنہائی
بہت سے اور بھی دنیا میں خود گھر ہوں گے

ٹھہریں گے اپنی ہی ناطقتی سے کتنے دیئے
لکھے کہ جرم ہولوں کے نام پر ہوں گے

ہمیشہ ہم پہ رہا التفات برق و شرر
جو راکھ ہوں گے وہی تو ہمارے گھر ہوں گے

کسی طرف تو یہ ذی ہوش رخ کریں گے ضرور
ذرا سے کھینچے ہوئے اس کی راہ پر ہوں گے

نہ جانے کتنے ہوئے درہر وطن آ کر
نہ جانے کتنے ابھی اور درہر ہوں گے

سمجھ میں آگئی زندانیوں کے رسم وفا
اگر یہاں سے چھٹے بھی تو دار پر ہوں گے

وہ ہوں گے مصلحت وقت ناشناس ضرور
حریف باد مخالف شہاب اگر ہوں گے

مگر فاقہ بلائے شک رہا ہوں
اب اپنا آپ رستہ تک رہا ہوں

معاف اے زندگی کر دے مجھے اب
راہِ محرم تو میں بھٹک رہا ہوں

مجھے کھوئے تو شاید خود کو ڈھونڈے
میں اس کے ساتھ اس حد تک رہا ہوں

نبھائے دوستی کے سارے موسم
مگر اے زندگی اب تھک رہا ہوں

دیر ایفاء پہ مثلِ حرف آخر
جہین شوق کی دستک رہا ہوں

شہاب آئی نہ مجھ کو دنیا داری
نصاوں تک تو میں زیرک رہا ہوں

انور شعور

کھلتی عین زبان ترے زور و ہنوز
کرتا ہوں اپنے آپ سے میں گفتگو ہنوز
ہیں ایک دوسرے کیلئے کہتے بے وجود
دنیا کے ہست و بود میں اور تو ہنوز
ایک ایک چیز وقت کے ہاتھوں بھر گئی
دل میں بھی ہوئی ہے تری آرزو ہنوز
رجتی تھی اللہ میں طلب جس کی گاہ گاہ
آتا ہے یاد وہ دہن مٹک و تو ہنوز
آغاز شام جشن شرب اور اس طرح؟
ساقی نہ سے گسار نہ جام و سپو ہنوز
دیکھیں لوگے قرض ہو کس روز کس جگہ
ہوتا ہے راستوں کی اندی پہ رخصت ہنوز
سب اٹ چکا جواہر و ملبوس و اسلحہ
البتہ ملوک زیت ہے تب گلو ہنوز
اے ظلوئی خانہ غیر آگے تو اٹھا
بہار ہے شعور ترا گلو پہ گلو ہنوز

بخش لائپوری

مرے گھر کی فضا بدلی نہیں ہے
ستم گر نے سزا بدلی نہیں ہے
ازل سے آہ و زاری سن رہے ہیں
اسیروں نے نوا بدلی نہیں ہے
مرے بدم دعائیں مانگنے سے
کبھی آب و ہوا بدلی نہیں ہے
گلوئے حق پہ ہے باطل کا خنجر
صدٹ کر بلا بدلی نہیں ہے
وہی بوسیدگی ہے تن بدن پر
فقیہوں نے قبا بدلی نہیں ہے
کئی آتی نہیں شور فغاں میں
ابھی رسم جفا بدلی نہیں ہے
وہی سیار ہے دامن ہوس ہے
گلستاں کی فضا بدلی نہیں ہے
میں ہر گم گشتہ چہرہ ڈھونڈتا ہوں
مری عادت ذرا بدلی نہیں ہے
مرض کچھ اور مسلک ہو گیا ہے
طبیہوں نے دوا بدلی نہیں ہے
خداوند زمیں بدلے گئے ہیں
مگر خالق خدا بدلی نہیں ہے

حسن عابد

عشق بے باک ہے پایہ سلاسل میرا
شہر میں سارے ہیں آزاد مگر دل میرا

زندگی کے نئے احساس کے رشتے جاگے
آگ جنگل کو لگی جلنے لگا دل میرا

شیوہ آب رواں میں ہے وہی عکس جیل
موج در موج ہے بہتا ہوا ساحل میرا

لہ نسیاں نے عجب حال کیا راہوں کا
چشم بند آب ہوا جادۂ منزل میرا

سب ہی آغوشِ تمنا میں تھے صورتِ دل
کیا بتاؤں کہ دکھا کس کے لئے دل میرا

پھر ہے سب ملامت / بازارِ حرم
پھر لو رنگ ہوا جادۂ منزل میرا

اب نہ مفتی نہ نقہیانِ حرم، سب چپ ہیں
صاحبِ مسند اورنگ ہے قافلِ میرا

عباس تابش

پانی آگے میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب کھیں جتنا شہر چلایا جا سکتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

دل پر پانی پیئے آتی ہیں امیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

مجھ گم نام سے پوچھتے ہیں فریاد و مہنوں
عشق میں کتنا نام کھلایا جا سکتا ہے

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھلایا جا سکتا ہے

پشنا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابش
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

شوکت فہمی

کاش آجائے مجھے جاں سے گزر جائے دیکھے
اس کی خواہش تھی کبھی مجھ کو بھر پور دیکھے

وہ سلیقے سے ہوا ہم سے گریزاں درندہ
لوگ تو صاف محبت سے مکرے دیکھے

ایک سہمے ہوئے سامل کی طرح آنکھوں نے
کتنے چڑھتے ہوئے طوفان اترتے دیکھے

تم نے دیکھا ہے کتنا ہوا سورج لوگو!
تم نے کچھ خواب سامنے نہیں مرتے دیکھے

وقت ہوتا ہے ہر اک زخم کا مرہم فہمی
پھر بھی کچھ زخم تھے ایسے جو نہ ہرتے دیکھے

ریحانہ قمر

انگلیاں پھیر رہا تھا وہ خیالوں میں کہیں
لمس محسوس ہوا ہے مرے بالوں میں کہیں

اب مرا ساتھ نہیں دیتا پیادہ دل کا
ہار جلاں نہ میں آکر تیری چالوں میں کہیں

اس شخص پر بھی رہتا ہے یہ دھڑکا دل کو
کھونہ جلاں میں ترے چاہنے والوں میں کہیں

ایک سورج نے مجھے چاند کا رجبہ دکھایا
درندہ ہوتی میں کتاؤں کے حوالوں میں کہیں

مجھ کو لگتا تو نہیں وہ متزلزل لیکن
اس کو وحشت ہی نہ لے جائے غزالوں میں کہیں

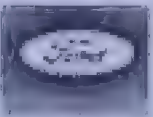
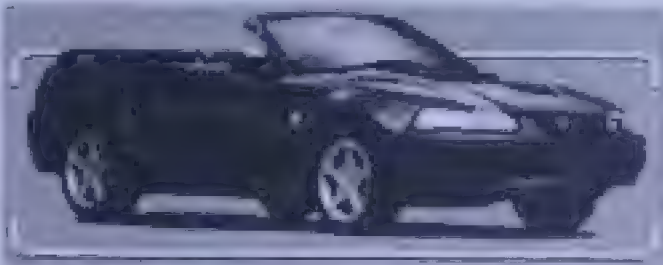
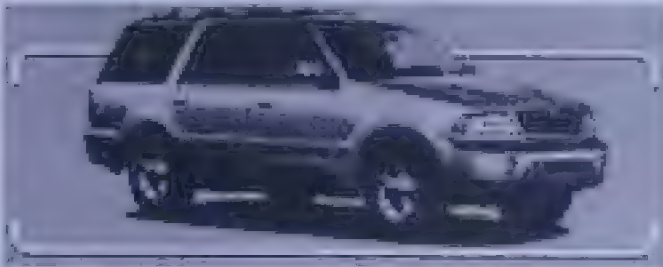
رندھیر سنگھ

اتے دنیا ہے	آنکراں	دل	دا
ٹھانڈاں	دل	دا	
کھیت غماں دے	دل	دا	بھانڈاں
واہنڈاں	دل	دا	
لہڑی زت وچ	پیار	چ	روٹیاں
ٹھانڈاں	دل	دا	
منولوں	روگ		لگانڈاں
کاتراں	دل	دا	
عقل دا	رب	توں	پانڈاں
ٹھانڈاں	دل	دا	
پچل سنگھ دکھ دے	پریم		بھنڈاری
ٹھانڈاں	دل	دا	
دے دھرتی تے	صبر	دا	چولا
چھانڈاں	دل	دا	

MEHRAN MOTORS

ایک خاص شہری سٹیشن

جو 1995ء اور 2000ء کے درمیان کی گاڑیوں میں ہے،
انہیں گاڑی میں دیکھا جائے گا اور ان کی بہت سی حالتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔



• ہمارے پاس ہر ماڈل اور ہر کلر میں ٹاؤن کاریں دستیاب ہیں
• نیکی ڈرائیورز کیلئے اسپیشل ہول سیل ریٹ

• اسکے علاوہ ہمارے پاس Nissan, Mazda, Toyota,
Chevy, Mistubishi and Ford

کی کاریں، وین اور جیپ دستیاب ہیں
• ہول سیل آکشن سے گاڑی خریدنے میں بھی مدد کرتے ہیں

الیکٹرک کا کام تسلی بخش کیا جاتا ہے

WE SPECIALIZE IN TOWN CARS

- Best Price in Town
- We Sale, Trade, Purchase Used Cars
- Financing Available
- Get Approved in One Hour
- Bad Credit, No Credit, Bankruptcy
NO PROBLEM!!



TOWN CARS AVAILABLE IN ALL COLORS & MODELS

رابطہ کیلئے: میاں ریاض اور ارشد بٹ

Tel: (718) 784-9807 • Fax: (718) 784-9861

38-21 23d Street, L.I.C., NY 11101

E-Mail: MehranMotor@aol.com

افسانے

انگلش چینل کا پیراک

ڈاکٹر سہیل آئند

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف تہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی۔ ایک لمحہ کے لئے ہوائی لڑنے کی ٹراژڈی لائن کی وہ جمل غضا میں معلق رہی، پھر شیشے کے وزنی دروازوں کو توڑ کر باہر ہوائی چڑی کی طرف بڑھی۔ اور پھر اڑان بھرتے ہوئے انٹر انڈیا کے طیارے کے پیچھے پرواز کر گئی۔

جب اس نے میری طرف آنکھیں کھلیں تو وہ بے جاٹھا تھا۔

انجی دیر کے بعد میں نے کہا، "اجیت سنگھ تم بہت بدل گئے ہو۔"

"ہاں بھائی صاحب۔ تو وہ لا "تبدیلی تو قدرت کا اصول ہے۔ اگر ہم بدلیں نہیں، تو جلد ہو جائیں۔ ہم ملے بھی تو چند روزہ سول کے بعد میں۔ آئیے، ایک چٹر ہو جائے۔"

پتھر دکا ہوائی لہو پرپ کے مصروف ترین لاؤں میں سے ایک ہے۔ ہر طرف گھبراہٹ، قسم قسم کی زبانوں میں گفتگو، چمیل چمیل، لیکن ریل چلی نہیں۔ ٹرانسٹ لائن کا ماحول غوا میں ایک کشش رکھتا ہے۔ گدے دار کرسیوں پر لوگ بیٹھے پاؤں گھومتے ہوئے، کچھ لوگ ڈیوٹی فری دکانوں کا طواف کرتے ہوئے، کچھ وقت کئی کیلئے بے لادہ طے ہوئے اور کچھ میری طرح اخبار پڑھتے ہوئے۔ میں دار سے لندن تک پولیشن ایئر لائنیز کی مسج کی فلائٹ سے پانچا تھا۔ اور مجھے دس گھنٹوں کے انتظار کے بعد ایئر کینیڈا کی فلائٹ فور نو کیلئے پکڑنی تھی۔

ابھی چار گھنٹے ہی گزرے تھے، مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اخبار کو تھمہ کیا اپنی پڑھنے والی ٹینک اٹھاری۔ جیجی مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ سے دس قدم دور کھڑا ہو ایئر پورٹ سیکورٹی کی اردو میں ملیں ایک شخص مجھے بسنظر خود دیکھ رہا ہے۔ رنگ اور چہرے کے خدو خال سے وہ ہندوستانی لڑکا تھا لیکن اس کی غیر معمولی توجہ میرے لئے سرور کا سبب بن گئی۔ طیاروں کے انعام دار بین الاقوامی رجسٹر گرونی کے اس زمانے میں کون ایسا ہوئی مسافر ہو گا جو ہوائی سیکورٹی کے کسی کارندے سے لپٹنے کی کوشش کرنے کا؟ میں نے پسوبہ لا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔ لیکن لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اخبار پھر پوری طرح کھول کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ ایک منٹ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ایئر پورٹ سیکورٹی کا کارندہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اخبار ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہی۔۔۔؟"

میں نے انگریزی میں کہا، "کیا بات ہے؟"

خلاف توقع وہ پنجابی میں لا۔ "بھرا ائی۔ آئند صاحب۔"

"ہی۔۔۔؟" میں نے بڑبڑا کر کہا۔ "آپ کو کچا نہیں میں نے؟"

وہ آگے بڑھا۔ "کوئے بھرا ائی۔ آپ نے اجیت سنگھ کو نہیں پہچانا؟ تیر کو "اپنا چھوٹے بھائی کو" ہے غلام کو؟" اپنے ہاتھوں سے میرے گھٹے چھوتے ہوئے اس نے احترام کا مظاہرہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے مجھے اٹھاتے ہوئے مجھ سے الٹکھڑ ہو گیا۔

"میں ہی۔ میں آپ کا جیتو۔ آپ کا چھوٹا بھائی۔ آپ کا غلام ہی ا" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہی؟ آپ کو تو روز یاد کرتا ہوں۔ اب پنجاب میں میرا کون ہے؟ آپ بھی مجھے بھول گئے ہی؟"

"اجیت سنگھ ا" میں نے کہا۔ "کرے تم دو میرے بھائی اس نے تو سوچا کوئی سیکورٹی کا انسپر میری ملاشی لینے کے درپے ہے۔" میں نے پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ "تمہیں کیسے بھولوں گا۔ میرے عزیز اکیلا میں پنجاب کے سب سے بڑے پیراک اور اپنے دوست کو بھول سکتا ہوں؟"

دو میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب میں نے دیکھا آپ کو تو میں نے کہا، دنیا بھر کی او بھر ہو جائے، میں غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے بھرا ائی ہیں، تب میں نے سوچا، دیکھوں مجھے پہچانتے ہیں بھی کہ نہیں؟"

میں نے پھر پورے نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ جس میں پہلے اجیت سنگھ میری آنکھوں کے سامنے ابھر آیا، یوں تھا ہو ایسے، بھرا ہو اچرا، جس پر ابھی مسیں پھوٹی ہی تھیں۔ آنکھوں میں شرم و جاتی کی گھٹا مستی اور اس پر پاؤں کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں۔ جو ایک پیراک کی خاص تھیں۔ اجیت سنگھ، عرف جیتو، جو سارے دیہاتی علاقے کا مانا ہوا پیراک تھا، جس نے ہر سال دیہات کے سوبائی کھیلوں کے مقابلوں میں تالاب کی رود سوباد لمبائیاں تیر کر کھلاڑیوں اور منتظمین سے اپنا لوہا منو لیا تھا۔ اجیت سنگھ، جس پر گاؤں کی الودیشیز انکس مرتی تھیں۔ جو ابھیرے اور جیو سٹری میں تو ہر بار ٹیل ہوتا تھا لیکن تیراکی کے مقابلوں میں ہر بار پہلا انعام جیتا کرتا تھا۔

جیتو!

وہی جیتو تھا لیکن کتنا مختلف ابو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس کے گال چمکے ہوئے تھے، سر کے بال پٹکے ہوئے ہوئے غائب ہونے لگے تھے۔ اس کا سینہ ابھر اہوا تھا لیکن ہانسی ایک دسے کے مریض کی طرح تھی۔ چالیس ایک دس کا ہوتے ہوئے بھی وہ چپاس مچھن سے تمکا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ ہاں اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ زندگی کی روشنی کی وہ لہر تھی جو وہ چہرے کے انخلاء کے بعد بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ جب اس روشنی کی لہر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو میں نے پوچھا۔

"چند روزہ سول میں ایک بار بھی اہس وطن نہیں گئے؟"

اور تب مجھے ایک لمحے کیلئے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف تہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی ہو۔ تھوڑی دیر کیلئے وہ اس معلق رہی ہو اور۔۔۔ پھر ایئر انڈیا کے طیارے کے پیچھے اڑ گئی ہو۔

ہم لوگوں نے ایک ایک سٹریٹی۔ پھر اس نے کہا۔ "بھرا ائی! آپ تھوڑی دیر بیٹھنے میں آؤ۔"

گھنڈ کی شارت لیو (لیل الہدٰی) لے کر آتا ہوں۔ پھر قتل اور دل جمعی سے بیچیں گے۔

جب وہ چلا گیا اور میں نے خبر کا ایک اور منگ سامنے رکھ لیا تو یادوں کے دہانے میں مقصود کے ادائی لڑنے کی یاد کا ماحول یہ گیا۔ اور میں چند دھڑکنے والے پسینے کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں میں یونوروشی پر دھیر نہ تھا۔ اور اجیت سنگھ ایئر پورٹ سیکورٹی کا کارندہ نہ تھا۔ جہاں ہم دونوں جھگڑنے کے رہتی تھے۔

اجیت سنگھ مجھ سے تین برس چھوٹا تھا۔ صوبہ اربہ روت سنگھ کا لڑکا، الزا، اکڑ، تھوڑا سا، لیکن بہت ہی پیارا اور دوستوں کا دوست، یادوں کا پار، اس کے والد کو اتلی کے مورچے پر لامثال بھاری کیلئے وکٹوریہ یا کر اس کا تھا جو برطانوی سلطنت کا سب سے بڑا فوجی اعزاز تھا۔ مشہور تھا کہ صوبہ اربہ روت سنگھ اپنا اپنا تھا تو دستاں میں بیٹھ اس لئے کہتے تھے کہ جس ہاتھ کو تھپہ سینے پر آویزاں ہونے کے بعد فرماؤں انکسٹان سے ملنے کا اعزاز عطا ہوا اور وہ اب کسی اور معنوی شخص سے ملنا چنگ عزت ہے۔ صرف اجیت سنگھ یا اس کے قریبی دوستوں کو ہی اس بات کا علم تھا کہ صوبہ اربہ روت صاحب کا اپنا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور اس کی جگہ دیکھ کا مصنوعی ہاتھ تھا۔ جس پر وہ بیٹھ وستانہ چڑھا کر کہتے تھے۔ عزت کی بات یہ تھی کہ اس مصنوعی ہاتھ کی اگلیاں قدرتی ہاتھ کی طرح چلتی تھیں۔ اس میں وہ گلاس پکڑ سکتے تھے۔ گانچہ کھول سکتے تھے۔ ستریس سے لوپر کی عمر ہونے کے باوجود اپنے بڑھاپے کی اولاد اجیت سنگھ کی پٹائی کر سکتے تھے۔ اجیت سنگھ کی ماں تو اسے پیدا کرتے ہی مر گئی تھی۔ ایک بوجھ بھی نے اسے پالا تھا۔ لیکن وہ بھی اجیت سنگھ کی کم عمری میں ہی خدا کو پیاری ہو گئی تھی۔ جیتو پہلی بار پھنسی بھارت میں لٹل ہوا۔ میں تب نویں جماعت میں تھا۔ نتیجے کے دن گھر پر اس کی خوب پٹائی ہوئی لیکن ایک ہفتے کے بعد ضلع کے میراکی کے مقابلوں میں اول آئے پر اسے تھوڑا سا شیف کیٹ اور دو سو روپے نقد انعام میں ملے۔ تو بیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے ذاتی اختیارات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ساتویں جماعت میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد جب ٹھکر تعلیم سے کھیلوں، جسمانی مقابلوں اور پی ٹی کا اختیاری مضمون وجود میں آگیا تو جیتو کے دن بدل گئے۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم سب نے جلوس کی شکل میں جیتو کو پھولوں کے ہار پہنا کر بس پر بٹھایا تھا کہ وہ ضلع کے صدر مقام پر جا کر اپنی حیراکی کا مظاہرہ کر سکے۔ مقابلہ مختلف ضلعوں کے کھلاڑیوں میں تھا۔ گاؤں کے تالاب اور نواحی گاؤں کی جھیلیں اور نہروں میں تیرنے والے جیتو نے نہ صرف ہر مقابلہ جیتا اور کئی ریکارڈ توڑ دیے بلکہ قماشائیوں کی خاص فرمائش اور ذہنی کشش صاحب کے ایک خاص ذاتی انعام کے اعلان کے بعد سو ٹھکر پول کے چھ گھنٹوں میں 180 چکر پورے کر کے صوبائی ریکارڈ بھی توڑ دیا تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں تو ان کے تراشے کئی میٹروں تک ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں دیواروں پر آویزاں رہے۔ اس کے والد نے تراشوں کو فریم کروا کے اپنی فوجی تصویروں کے ساتھ لٹکایا۔ اور وہ دن میں کیسے ہم لوگوں کا جب آرامی رات کے وقت میری بیٹھک کے باہر گلی میں کھٹنے والے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو جیتو کو کھڑے پایا۔ اس کے پیچھے سڑ سے پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے ایک شہید تھی جو سردی سے کانپ رہی تھی۔

”جیتو! اندر آ جا۔ کیا بات ہے؟ کون ہے تمہارے ساتھ؟“

”بھرائی! اب جس گھر ہے، چرن سنگھ کی بہن۔“ اس نے کہا ”میں اندر نہیں آؤں گا، مجھے آپ کی مونہ سائیکل چاہیے، مجھے اسے شہر لے جانا ہے۔“

”جیتو! اندر تو آ۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس کے پیچھے ہر جس گھر بھی

تھنکتی، کپکپاتی ہوئی اندر آگئی۔ ”مجھے جہاں ہر جس گھر۔“ میں نے کہا ”ہاں اب بتا کیا بات ہے؟“

”اس کی شادی کر رہے ہیں، پرنسپل، ملنا والے کے زمیندار جو گندہ سنگھ کے ساتھ۔ جو گندہ سنگھ پچاس سال کا ہے اور اس کے بھائی نے پانچ ہزار روپے لئے ہیں اس سے۔ میں نہیں ہونے دوں گا کی یہ شادی! والگوروی سو گندہ سنگھ نہیں ہونے دوں گا!“

”شہر میں کہاں لے جا رہے ہو اسے؟“

”ڈی سی صاحب کے پاس ہی۔۔۔ ابھی پچھلے ہفتے تو انہوں نے کہا تھا جیتو! جب ہی چاہے میری کو بھی آجایا کرو۔ میں ان کے لڑکے کو تیرا سکھاتا ہوں۔ بھرائی!۔۔۔ بڑے اچھے افسر ہیں۔ خود تیرا کر رہے ہیں، مجھے ہر اس مقابلہ کیلئے ہکا رہے ہیں۔ کہتے ہیں روس بھی کھینچے گئے۔ انہیں کون گا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اٹھارہ برس کی لڑکی کا بیاہ اس کی مرضی کے بغیر ہی کر دیا جائے؟ عدالت میں اس سے شادی کروں گا کی!“

جیتو ہر جس گھر کو لے کر ڈی سی صاحب کے پاس نہیں گیا کیونکہ اسی وقت میری ماں اور میرے والد اندر سے آگئے اور انہوں نے چرن سنگھ کو بلا کر اس کی بہن کو اس کے حوالے کر دیا۔ صوبہ اربہ روت سنگھ بھی آگئے۔ اور جب سمجھانے بٹھانے کے بعد جیتو بھی ان کے ساتھ چپ چاپ چلا گیا تو میں نے سوچا یہ جیتو کی زندگی کی سب سے بڑی شکست ہے اب وہ کبھی تیراکی کے مقابلہ نہیں جیت سکے گا۔ کبھی سر اٹھا کر گاؤں کی گلیوں میں نہیں چلی سکتے گا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ریت کی طرح خشک ہو کر نیم جان ہو جائیں گی۔ وہ نوٹ جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کبھی کلب کے سولنگ پول میں لائف گارڈ کی نوکری کر لی ہے۔ چھ ماہ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ گاؤں لوٹا تو میں یونوروشی میں داخلے کیلئے شہر جا چکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ میرے ہوٹل میں مجھ سے ملنے آیا۔

”بھرائی! ایک مقابلہ کیلئے یہاں آیا تھا۔ آپ سے ملے بغیر کیسے جاسکتا تھا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک تنہید کی تھی۔ ایک ٹھہرا ہوا تھا، زندگی نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ ”کیا پروگرام ہے اب؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”بھرائی!“ اس نے کہا تھا ”میں ہر اس بھی گیا تھا، جس کوئی کے ساحل سے لڑا تھا تیرا بھا سکتا ہے۔ کئی لوگوں نے یہ فاصلہ عبور بھی کیا ہے۔ مجھے ہر اس کی ایک کلب سے آفر بھی ہے، میں آپ کی دعا سے یہ دوری طے کر لوں گا۔“

”بہت خوب، اجیت!“ میں نے کہا تھا۔ ”وہ دن بھی آئے گا جب تم انگلش پھیل پار کرو گے۔“

”وہ کہاں ہے بھرائی؟“ اس کی آنکھوں کی چمک اور گرمی ہو گئی تھی۔

اور تب میں نے اسے انگلستان اور فرانس کے ساحلوں کو دھرتے ہوئے اس چھوٹے سمندر کا ذکر کیا تھا جو 24 کلومیٹر چوڑا ہے اور جسے تیر کر پار کرنے والے ایک نہیں درجنوں ایسے تیراک ہیں جو کئی کئی برس کی مشق اور کئی بار کی کوشش کے بعد کامیاب ہوئے ہیں۔ میں نے اٹلس نکال کر اسے پوری تفصیل سے اگاہ کیا تھا۔ ”انہی دنوں“ میں نے اسے بتایا تھا ”ایک لکلی نوجوان نے بھی یہ کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اور شاید ایک یا ایک سے زیادہ عورتیں بھی اسے تیر کر پار کر چکی ہیں۔“

”اس کیلئے انگلستان جانا پڑے گا؟“ اس نے پوچھا۔ ”پاسپورٹ بنوانا پڑے گا؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ ابھی لینا پڑے گا جو ذرا زیادہ مشکل کام ہے۔“

باکس شخص ہر جس کا جیتو، جسے تیراکی کے سب سے پہلے پسند تھے، جو عورت کے پیار کی بازی ہار

چکا تھا۔ جب میرے کمرے سے گیا تو پوری شخصیت لگے کر لے گیا ایک امید کے ساتھ جو اسے ایک دن انگلستان لے جا کر یہ مقابلہ جیتنے میں مددگار ثابت ہو گیا۔

یادوں کے بادل گزرے ہوتے چلے گئے۔ میں نے ستر منگوا لی اور پھر ماضی کے دھندلے میں کھو گیا۔

میں جب گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دو بار کاہن گیا تو جیتنے کی خبریں ملیں، وہ فلاں مقابلے میں اول آیا۔ اسے فلاں انعام ملا۔ فلاں افسر یاد کرنے سے دلالت دیکھنے کا وعدہ کیا اور صوبائی صدر مقام پر آکر ملنے کیلئے کہا۔ فلاں جگہ بھرے ہوئے چلے میں یہ کہا گیا کہ جیتو دنیا کا سب سے عمدہ تیراک ہے اور اگر اسے باقاعدہ تربیت ملے تو وہ لوہے کی کھیلوں کے مقابلے میں سونے کا تمغہ جیت سکتا ہے۔ لیکن ہر بار یہ بھی سننے کو ملتا کہ ہزاروں کوششوں کے باوجود جیتنے کی شمولی سرکار کے ان طبقوں تک نہ ہوئی جو ان کا سونے کیلئے رقبے مخصوص کرتے ہیں یا کھانڈیوں کی فرسٹ کو آخری شکل دیتے ہیں، ہر بار اس کی جگہ کسی سفارشی کا نام ڈال دیا جاتا اور اس کی بیٹے چھپتا کر اس کی تعریف کے پلہ پلہ کر افسر لوگ اسے کہہ دیتے کہ اگلی بار تمہارا نام ضرور ہر فرسٹ ہو گا۔

یہ سہو سنی میں بیکھر رہنے کے بعد میرا کاہن آجایا، کل دن وہ گیا۔ زندگی ایک دوسری ڈگر پر چلنے لگی۔ اکثریت کی ڈگری کیلئے امریکہ گیا تو تین برس تک گئے۔ اس کے بعد بھی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کیلئے اسی یادیں دن ملک جانا پڑا۔ اس لئے جیتو سے تعلق تو ایک طرح سے قائم ہی رہتا تھا۔

اگلی دو سال کے بعد کھانڈی کے اسکول سے ایک نچلے کسی ذاتی کام سے یونیورسٹی میں آئے اور مجھے اور اسی وقت ملے تو انہوں نے بتایا کہ جیتو انگلستان پہنچ گیا ہے۔

میں بہت حیران ہوا، "کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت مایوس ہو گیا تھا بے چارہ،" وہ لے۔ "تھارت سے شری لاکا کا فاصلہ ایک بار نہیں دو بار اس لئے طے کیا۔ اور بے چارہ، جیتو کی لڑائی میں ہار ہار طواف کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن اسے باہر جانے کیلئے مالی امداد کسی نے بھی نہ دی۔ دزیوں، افسروں اور کھیل مقابلوں کے کارکنوں کے وعدے کبھی پورے نہ ہوئے۔ بے چارے کو قدم قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر ایک دن کھانڈی آکر اس نے اپنے کھیت اور اپنا مکان بیچ دیے اور جو نہیں چاہیے بڑا لٹے وہ ایک نرپول ایجنٹ کو دے کر جھلی دینے پر آمین اور پھر وہاں سے تری پہنچ گیا۔ وہاں سے مغربی جرمنی اور کئی ایک مینوں کے بعد انگلستان۔ یہ معلوم یہ سارا سفر اس نے کیسے طے کیا۔ لیکن مجھے اس کے خط باقاعدگی سے ملنے رہے اور مجھے علم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے خیال میں اب اسے انگلستان میں قانونی طور پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔"

"یہ تو بہت سارے کی خبر ہے۔" میں نے کہا "اس کی جھنجھکی یہ خواہش تھی کہ وہ تیر کر انگلش چیمپئن بن جائے۔ اچھا خیال میں تو کوئی خبر نہیں آئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔"

"بھرائی۔" "جیتو مجھے یادوں کے گھرے دستہ لکے۔ دلہن بھرتی کی بار کے ماحول میں کھینچ لایا۔" مخالف کریم مجھے دبوچ ہو گئی۔

"آپ کی قیادت گیت نمبر 12 ہے۔" ادا سے پاس وقت ہے۔ آئیے کھڑے ہو جا کر لیں۔"

ہم دونوں فریڈنٹ 1967 کے، مشورہ میں چلے گئے۔ وہ اس تھا۔ لیکن اس ادا کی مین چار کے طور پر بھی ایک اور ریزرو وہاں تھا۔ جس سے وہاں اپنے دل کی انگلیں کو چھپا دیا تھا۔ "آپ کیلئے کیا تھا؟" بھرائی۔ "اس نے کہا۔" آپ تو اپنی دنیا گھوم چکے ہیں۔

آپ کیلئے کون سی چیز تھی؟ میں میری تو دعا ہے کہ وہ انکو رو آپ کو سکھی رکھیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو دکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ "جیتو! پنجاب لوٹ جاؤ۔ یہاں کی آب ہوائے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کہاں جاؤں گا، بھرائی؟" وہاں اب میرا کون ہے؟ یہاں ابھی اپنے ہیں، دوست پار بھائی، میری زبان بولنے والے، ایئر پورٹ پر کئی علاقے کے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔"

"تمہاری صحت کو کیا ہوا جیتو؟" میں نے آخر پوچھ لی۔

"بھرائی صحت تو تری میں ہی خراب ہوتے لگی تھی۔ کئی مہینوں ہو گئیں میں برتن دھوئے، کاریں صاف کیں۔ عمارت سازی کے کارخانوں میں کام کیا۔ کام کا پرست نہ ہونے کی وجہ سے جرمنی میں نیل بھی کافی۔ پھر یہاں جھلی پاسپورٹ پر پہنچا۔ اجیت سنگھ تو ایک عام نام ہے۔ اس نام کے پاسپورٹ اور ویزے عام ملتے ہیں۔ یہاں آکر پہلے کپڑے کی دھوئیں میں کام کیا۔ کچھ مہینے کوٹنے کی کانوں میں بھی کام کرنا پڑا۔ تب نمودار ہو گیا۔ پھر پلیسور ہی نہ گئی اور ایک پیچھے میں پانی بھر گیا۔ علاج ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے، میں نے تیر کر اپنے پیچھے کی دھوئیں کی خراب کر لی ہے۔" وہ ہنس۔ "خیر علاج ہو گیا۔ پھر لندن گیا۔ اب آٹھ برس سے یہاں ہوں۔ ایئر پورٹ سیکورٹی میں ابھی نوکری ہے۔ چھ سات سو ڈالر مل جاتا ہے اور گزارو خرچ سے ہو رہا ہے۔"

"اور تمہاری تیراکی کا شوق، جیتو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمبے کیلئے روشنی سی لہرائی۔ لیکن وہ چپ رہا۔

"اور انگلش چیمپئن کو میڈر کرنے کا مزہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسنا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "انگلش چیمپئن تو میں نے میڈر کر لیا، بھرائی!" اس نے کہا۔ "پوری طرح میڈر کر لیا۔" وہ دیکھتے۔ "اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ کچھ دوری پر ایک گوری انگریز عورت مسکراتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ "آپ کو ملوانے کیلئے اسے کام سے بلوائے۔ خاص طور پر کہا کہ آجائے اور اپنے جیتو بھائی سے مل لے۔"

اس سے پہلے کہ میں جرات میں ادا ہوا اس سے کچھ پوچھ سکتا۔ قریب آنے والی گوری عورت کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میرے سامنے کر دیا۔ "یہ منگی ہے جی ادا کر پٹ سنگھ، میری بیوی۔" میرے بچے کی ماں۔ اینڈرس ادا کی زور، مائی فریڈ، مائی بھرائی جی!"

اس نے انگریزی میں اسے میرا تعارف کر دیا۔ "بھائی شاہی، بھرائی آٹھ برس پہلے ہوئی تھی۔ منگی ہسپتال میں زخم ہے۔ اس نے میری ہماری کے دونوں میں میری خدمت کی تھی۔" اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ "بھرائی! آج آج ہر وہ ٹو کیڈل۔" اس نے اسے انگریزی میں بتایا۔

میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میری ادا ہے کہ آپ دونوں خوش رہیں۔"

میں نے انگریزی میں کہا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اجیت ملا۔ میں اسے بہت پیار کرتی ہوں۔ اور اس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

اور گیت نمبر 12 کی طرف منہ دھرتے ہوئے جیتو نے کہا۔ "بھرائی! اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ میں نے انگلش چیمپئن کو میڈر کر لیا ہے۔"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "کھانڈی کے مایاب سے انگلش چیمپئن کھانا فاصلہ تم نے طوفی پار کر لیا جیتو!" میں نے اسے گلے سے لگایا۔



صلیبِ ملامت

ارشدِ احمد صدیقی

سلور گرے BMW ایسٹ آبلو سے نکل کر ماگنی کی پر پچ سڑک پر سرعت سے ماضی کی طرف توجہ رہی تھی۔ کار کے کچھلی سیٹ پر عمر امریکن اداکار فیصل عبداللہ اور اس کی بی بی اور تھی شلوار قمیض میں ملبوس دو بچے سے سر ڈھانپے ٹھنکی تھی، وہ دیر سے خاموش اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قتل کے گروہن تھا کہ ڈور تھی کی طرف دیکھا اور آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ڈور تھی نے منکر کر قتل کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر مضبوط کر لی۔ وہ شان بلیا کے سالانہ عرس میں شرکت کیلئے نیویارک سے آئے تھے۔ شان، قتل کا گمراہ دست تھا۔ وہ دونوں راکی فیلر پر خود رشتی (نیویارک) میں طالب علم تھے۔ قتل لاء کی طرف راغب تھا۔ شان ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ شان اپنے والد جاگیر دار خان محمد سلیمان خان کی بی بی پر پاکستان آیا تھا اور پھر لوٹ کر تھیں گئے۔ شان نے قتل کو لکھا تھا۔ "اب شاید ہی ملاقات ہو، میری زندگی کے وعدے بدل چکے ہیں، میں جرم و سزا کی خاردار سرحد پر زخم زخم کھڑا ہوں۔ کیا سزا جرم کی اہل ہو سکتی ہے۔" "There is no salration without punishment" قتل کے واقعہ تھا جس سے شان کی خطہ نکلتا۔ مدت تک جاری رہی۔ وہ اس کے گھر سے غم کا مین تھا۔ شان نے خاندان کی مخالفت کے باوجود ایک جھوٹا سا مطلب کھولا۔ مزدور بھرتی کئے، گاڑیاں گاڑیں پھر کرناور کنیوں کی جھوٹی بیویوں کی مرمت کی۔ نئی جھوٹی بیویاں تعمیر کیں۔ بیویوں کا علاج کیا ملت وہ ایساں تقسیم کیں۔ پھر اس پر چپ کے دورے پڑنے لگے۔ مولانا جلال الدین رومی کا دیوان، ملٹن کی Paradise Lost اور دیوان غالب اس کی اہم سطر ہیں۔ وہ ہر صبح صبح کھولتا۔ ناور مریموں کو دیکھتا، وہ ایساں دیتا، باتیں کم ہی کرتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ مطلب کے سامنے وہی تھا کر چٹکان سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے گھٹنوں پر ٹھہرا ہوا۔ لوگ اس کے گرد جمع رہتے۔ دعا کی التجا کرتے اور جب وہ وقت ملنے لگتے تو شان ہاتھ بلند کر کے دعا مانگتا۔ اس کی بد آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔ پھر وہ مطلب ہی میں رہنے لگا۔ کلوم دن رات اس کے مطلب کے گرد موجود رہتا۔ لوگ دعا کی قبولیت کے ثمر دانے لے کر آتے۔ اس دوران اس نے قتل کو لکھا تھا۔ "خدا وہ دن لے لائے کہ یہ لوگ میری پوجا کرنے لگیں۔ یہ کتنے سادہ دل لوگ ہیں، میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ ان کے دکھ کتنے گہرے ہیں، ان کی سوچ تھی متحدہ ہے، ان کا کوئی کوتم نہیں، کوئی میسٹی، کوئی رسول نہیں، اگر ہے تو صرف خدا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔"

قتل نے آنکھیں بند کر کے کاہلی سے اپنا سر سیٹ کی پشت پر رکھ دیا اور اس کے ذہن میں شان کی ڈائری کے اور اق (جو اس کے پاس محفوظ تھی) لکھنے لگے۔ گزرے دنوں کی پڑچائیاں مجسم ہونے لگیں۔

میں نے رکھا تھا ٹریفک سڑک پر ریٹک رہی تھی۔ سبھی غلط تھے۔ میں عموماً سنی سا بچہ (کو بیٹا) سے سب سے میں ہی راکی فیلر پر خود رشتی چاہتا تھا۔ لیکن آج کار ادا ضروری تھی کہ لگے بچے کا بچ کے بعد خود چری میں قتل عبداللہ کے رشتہ داروں کی شادی میں شرکت کر رہا تھی۔ قتل نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ ڈور تھی کو ساتھ لے کر آئے۔ ڈور تھی میری کلاس فیلو تھی۔ اسے پاکستانی راہن سمن اور کلچر کا فحش تھا۔ اس سے عمل میں نے ڈور تھی کو کا بچ کے بعد ملنے کا کہی نہ کہا تھا۔ البتہ ہم لڑائی مانی کیلئے کہنے میرا میں اٹھنے ہو جاتے تھے۔ قتل بھی کبھی کبھی آجاتا تھا۔ قتل ڈور تھی کو پسند کرتا تھا لیکن وہ قتل کی طرف کم ہی توجہ دیتی۔ اسے سروت اور خوش دلی سے ملتی تھی، ڈور تھی کو شادی میں شرکت کی دعوت پر بہت ہی خوشی ہوئی۔ اس نے خوشی میرے ساتھ جانے کی نہ صرف جانی بلکہ بڑی جذباتی مسرت کا اظہار بھی کیا۔

ٹریفک سٹور ریٹک رہی تھی، ہدف کے گالے بے ترتیبی سے اڑ رہے تھے، سڑک پر پھسلن محسوس ہو رہی تھی، آریڈ پر خطرناک موسمی خبریں سنار ہا تھا۔ اب میں کو نیز بلوار پر تھا، ٹریفک مناسب رفتار سے چل رہی تھی۔ شاید کبھی کوہ وقت منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ اچانک میری دائیں لین سے ایک ٹرک تیزی سے بے قابو ہو کر پھسلتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میری چاروں طرف کاروں کے کارواں تھے۔ ٹرک ایک دھماکے کے ساتھ میری کار سے ٹکرایا۔ میری کار بائیں طرف کار سے ٹکرائی۔ میری کار کے عقب سے ایک اور کار بڑھا، گاڑی بہت ہی کار میں بے قابو ہو گئیں۔ دھماکوں اور رینگوں کی ہاتھوں کے ساتھ میری ہاتھوں میں شہت کا درد سراپت کر گیا۔ میرے سینے میں تکلیف وہ نہیں اٹھی۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ گمراہ ہوا سنی پارٹ، میرا کھینچا ہوا جسم پر، انڈر کرنے لگا۔ وہ غلاؤں سے ابھرتی موسیقی کی یکسانیت، گولہ محسوس ہونے لگی۔ ہوا کے ٹکڑے جھونکے جسم کو چھو رہے تھے۔ میرا جسم سٹور بارش میں بہک رہا تھا۔ بارش کے قطرے جسم کو تکلیف دے رہے تھے۔ میں بہ سٹور کو پروا نہ تھا، وہ موسیقی، وہ گولہ موسیقی قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید دریا کی نہیں اٹھی، اچانک اندھیرا گہرا ہو گیا، جیسے ہم کسی عمارت میں داخل ہو گئے ہوں۔ غبارت ہو لوگوں کے منہ زور جھونکے جسم کے۔ دریا کی نہیں رک گئی۔ میں آرام سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ خوشگوار ہوا میرے ماسوں میں بس گئی، میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن سودن کی تیز کرنوں سے آنکھیں چند صبا گئیں۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے جسم کو ہلکا ہکا سرد ہوا میرا تھا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ مجھے غینہ آئی۔ صبح صبح میری آنکھ کھلی تو کوئی میرا ہاتھ تھا۔ کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں بہ سٹور نور ہی تھیں۔ شاید یہ میری ہی کی توانا تھی، وہ کہہ رہی تھیں اتنی جلدی جاسنے کی کیا پڑی ہے، تھوڑی دیر اور آرام کر لو، ماسی رو شو تمہارے لئے ہاتھ کمرے میں

لے آئے گی۔ اسی رات شوہاری پرانی دھڑکھڑکھ رہی تھی۔ اس نے ہنس کی طرح ہمیں پالا تھا۔ دن رات ہماری دیکھ بھال میں جی رہتی تھی۔ شام کو ہم کالے پلاٹے کے ساتھ سیر کو جاتے تھے۔ اس کا نام کالا خان تھا لیکن ہم اسے کالا بلیا کہتے تھے۔ اصلی لوگات ہم سیر کرتے ڈاک بھگے تک چلے جاتے تھے۔ ڈاک بھگے کا حوالہ، پہلی سیر امان کا لے جا کا دوست تھا۔ ہمارے آتے ہی چائے کی کٹلی جو لمبے پر رکھ دیتا۔ ہمیں چائے اور صحت دیتا۔ کالا بلیا اور پہلی سیر زمانا اپنے لئے غلہ دھو چائے مناتے اور ہار جی غاسے کے سامنے بڑھ جیوں پر بیٹھ کر کھڑے تھیا کو کی غلہ اور چائے پیتے۔ ہم ڈاک بھگے کے پیچھے پہاڑی پر جاتے۔ جہاں لٹنی لٹنی ہو جیوں کے جھوٹے جسم میں خوشگوار کھچکی پیدا کرتے۔ بخل کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ پر اسرار سرگوشیاں کرتی۔ اس پہاڑی پر یہ پنڈاں ہمارا نشان تھیں۔ ہم اس پنڈاں سے پشت لگا کر "لو ہو لو" کی زور سے آواز دگاتے ہماری آواز نالے کے اس پار پہاڑ سے نکل کر لوتی اور غصا میں ایک بار پھر "لو ہو لو..." کی صدا گونج جاتی۔ جھاڑیوں سے خوشگوشی نکل کر دوسری جھاڑی میں رو پھنسی ہو جاتا۔ کالا بلیا کھتا پہاڑ ہلائے تھیا کی آواز میں کر جواب دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑ بلیا تم سے خوش ہے۔ ہم شام کے اندھیرے اترنے سے پہلے گھر لوٹ آتے۔ میرا سرائی کی راحت انگیز گود میں رکھا تھا۔ وہ اپنی انگلیوں سے میرے بال سنوار رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ٹنگ رہی تھی۔

کس چیز کی کمی ہے خواجہ میری گلی میں

انہوں نے ابھی طرح مجھے کھیل میں ڈھانپ دیا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ سارا گھر اچانک خاموش ہو گیا۔ یہ سارے کہاں چلے گئے؟ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ دور سے آوازیں آرہی تھیں۔ شاید مصالحانے آئے ہیں، وہ بولے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ میں تو جاگ رہا ہوں یا میں سویا ہوا ہوں؟ میرے بازو میں جلی سی جھپٹ محسوس ہوئی۔ میری اٹی نے میرا سر سٹپا دیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھائی گھر سے سے نکل گئیں۔ ہمارے گھر کے مچھن میں بڑے درخت کے ساتھ ہموار لٹکا ہوا تھا۔ میں بھولے میں بیٹھا آہستہ آہستہ بھول رہا تھا۔ میں نے کھیل سے اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اسی رات شوہارٹ لے کر آئے گی، ابھی تو رات ہے سارے سو گئے ہیں۔ رات کی ہوا میں بڑی تیز کی ہے۔ میری سانس خوشگوار ہے، سارے سو گئے ہیں۔ میری آنکھ کھلی، اچانک ادھنی ماحول کا احساس ہوا۔ میری چارپائی کے گرد پردہ لٹکتا رہا تھا، میری ناک میں آنکھیں کی دایاں تھیں۔ میرا جسم چور چور تھا۔ میں ہسپتال میں تھا، میرے بازو سلامت تھے، میں نے گھنٹی بجائی، نرس مسکراتی ہوئی آئی۔ ہم سوچ رہے تھے آپ کے جاننے کا وقت ہو چکا ہے۔

"میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"کی آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، یا ہے؟" میں ڈاکٹر کو پلاتی ہوں۔ "وہ گھبراہٹ ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ قدرے سفید بالوں اور سرخیاں پھرے والے ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئے۔

"میں ڈاکٹر خیر شاہرگ ہوں، کیسے ہیں آپ؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم نہیں"

"آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، آپ اس وقت غلہ ست میڈیکل سنٹر کے ایمر جنسی وارڈ میں ہیں۔ مسٹر شان آپ خوش قسمت ہیں کیونکہ حادثے کی جو تفصیلات مجھے ملی ہیں، ایسے حادثے سے سلامت بچ جانا کمالات ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی دائیں ٹانگ کی بڑی ٹوٹ گئی ہے جو زیادہ تشویش کی بات نہیں۔ آپ کی ہڈیوں پر اور چاب۔ لیکن ٹوٹی نہیں۔ جسم پر معمولی لڑائیاں آئیں ہیں۔ آپ کا آج ٹیٹن کا میاب ہل آپ کی ٹانگ میں بڑی کچڑ نے کیلے لوہے کی پلٹ لگائی گئی ہے جو بعد میں اٹاری جاسکتی ہے۔ ٹانگ کے پلستر کی وجہ سے تو نہیں

البتہ ہڈیوں کے پلستر کی وجہ سے شاید آپ کو ابھرن محسوس ہو لیکن یہ ضروری تھا۔ آپ کی گردن کے گرد جو ہالڈ باندھا گیا ہے وہ عارضی ہے۔ آپ کی گردن بالکل محفوظ ہے، ایکسیڈنٹ میں گردن کو جھٹکا ضرور لگتا ہے لیکن آپ کی سیٹ بیٹ اور آپ کی کار کے ایئر بیگ نے آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ کو کم از کم چوبیس گھنٹے استراحت پر ہی رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔ مجھے یہ کہنے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ آپ جسمانی طور پر (اس حادثے کے باوجود) بہت ہی بہتر ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو کہیے؟" ڈاکٹر مسکراتا ہوا مجھے دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے لیکن میں اس سے کیا پوچھتا؟ میں اسے گھورتا رہا۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر آنکھوں کا معائنہ کیا، کان دیکھے۔ رات دیکھے۔ پھر میرے سینے کے پلستر کو دیکھا، ٹانگوں کو دیکھا۔ پھر نرس کو بلا کر بدست کی کہ میرے جسم سے آویزاں پلاسٹک کی تھیلیوں پر نظر۔ کے۔ اگر ان میں خون کی آمیزش نظر آئے تو فوراً معائنہ کیلئے لیبارٹری لگوائی جائے۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے مصافحہ کیا اور چلا گیا۔ نرس نے مجھے بتایا کہ میں سارا دن اور ساری رات Anesthesia کے زیر اثر ہے ہوش

"آپ کچھ کھانا پیئند کریں گے؟" نرس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ب کھائے کو؟"

"میں آپ کو فروٹ جس لا کر دیتی ہوں پھر آدھ گھنٹہ بعد دوپہر کا کھانا شروع ہو گا۔ ویسے آپ جو چاہیں کھا سکتے ہیں۔ لیکن بہتر ہے کہ آج پیر پیر نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد نرس جس اور کیم لیسٹ لے کر آئی۔ کہنے لگی اگر میں کسی کو اطلاع دیتا چاہوں تو وہ خوش فون کر سکے گی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اب میں اسے کیسے کہتا کہ پاکستان فون کر رہا ہے۔ کیلی فورنیا فون کر رہا ہے۔ نیویارک اور نیو جرسی وہ ہتوں کو فون کرنے ہیں۔ سوچا جب طبیعت بحال ہو جائے تو کبھی کو فون کروں گا۔ پارہا قریل کے رشتہ داروں کی شادی کا خیال آ رہا تھا لیکن ان کو اس وقت اطلاع دینا خارج از صحت تھا۔ سمجھتا تھا کہ میرے جیروں میں تکلیف ہو رہی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ غصہ کی بدستور تھی۔ میرا لائن اور میرا جسم غصہ کی اور بیداری میں لٹلاں تھے۔ مجھے امریکی کھانے کی پسند نہ تھی اور پھر امریکی ہسپتال کے کھانے ایک اور بڑا ب تھا۔ دو دن بد مزہ کھانے اور Pain Killer کے علاوہ میری رگوں میں فون اور ٹنگو کوڑی نالیاں میرے جسم کو زندگی سے رو شاس رکھتی رہیں۔ دو دن میں نے کسی سے بات نہ کی۔ "ہاں، ہاں" میں جواب دیتا تھا۔ سوائے ناشتہ کے کھانا کچھ گروا جس کو دیتا تھا۔ فروٹ، فروٹ جس اور چائے صحت پر گزارا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر یہ ستور مسکراتا ہوا آیا چارٹ دیکھ کر مسرت سے گمانا کہ میری Progress توقعات سے زیادہ ہے۔ "جس کی مجھے خوشی ہے۔" پھر اس نے بہت سے سوالات کئے جن کا جواب میں دیتا رہا۔

اس شام ڈاکٹر کے ساتھ کھلتے رنگ کی نرس تھی جو ہندوستانی بلیا کستانی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میری تھیلیاں بھرا، گولیاں دینا چارپائی پر لگی کر اس کا کام تھا۔

"میں آپ کی نرس ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے اس لئے انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے، لیکن ہے آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی۔

اس کی مولی مولی شرمیلی آنکھیں مجھے بہت ہی پسند آئیں۔ میں نے جواب نہ دیا۔ "تو آپ واقعی باتیں نہیں کرنا چاہتے؟" اس نے ارادہ میں کہا۔

”میں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں؟“

”جائے مل جائے گی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

”ضرور“ میں نے بے دلی سے کہا مجھے Tea Bag والی چائے بالکل پسند تھی۔ اس نے

چائے بنا کر میز پر رکھی اور میرا ہاتھ دیکھنے لگی۔

”آپ جو چاہیں لے سکتے ہیں پائے بالکل نہیں۔“

”وہ پیٹ میں اٹھی ہوئی بد ذائقہ چیزیں رکھ کر لے آتے ہیں جنہیں دیکھتے ہی بھوک مر جاتی ہے۔“

”تو آپ کو کیا چاہیے؟“

”ایک چھوٹا سا گلیں۔“ میری بات پر دوہرنے لگی۔

”اس کا بعد دست بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور

کمرے سے نکل گئی۔ جب رات کا کھانا آیا تو میں تیلی دیں دیکھنے میں مشغول تھا۔

”آپ کیلئے خام کھانا لے کر آئی ہوں۔“ آج میری پیٹ میں چھوٹا سا سٹیک آلو اور مہری تھی۔ اس نے میری چارپائی پر دست کی، کھانے کی میز لگائی، سٹیک پرانہ تھا۔

”آپ کو کچھ اور چاہیے؟“

”بہت بہت میری بانی، آپ کی بد ذلت آج کھانا کھا رہا ہوں، کچل سے پھر وہی ہفتہ وار میٹو شروع ہو جائے گا۔“

”تو ہوا کرتے، آپ کے رات کے کھانے کا ذمہ میرا ہے، فکر نہ کریں۔“

دوسرے دن قہقہے اور زور تھی مجھے دیکھتے آئے۔ قہقہے نے میری کار کے بارے میں ساری تفصیل بتائی، انشورنس کمپنی سے معرکوں کا حال بتایا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زور تھی اور قہقہے چمک چمک کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے نے کہا۔ ”یاد چائے مل جائے تو بات نہ کی۔“

”یہ ہسپتال ہے، یہ سٹورنٹ نہیں؟“ زور تھی نے قدرے فحش سے کہا۔

”چائے مل سکتی ہے۔“ میں نے کہا ”ذرا کرا کر ٹرس سٹیشن پر سعید ویم کی ٹرس کو بلا لائیں، پھر دیکھیں اس کا کرشمہ۔“

”اُسے فضا تو ہیں وہاں گاڈ فادر نے اپنی پرائیویٹ ٹرس بھی رکھ لی ہے۔“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ سعید وائی، میں نے اسے چائے لانے کو کہا وہ خوش خوشی چلی گئی۔

”بات ہوئی؟“ یہ سنبلہسی ہو تو ایسی ہو، مان گئے چاہا۔ مان گئے لیکن چائے کے ساتھ بھی کچھ نہ چائے تو۔ ”وہ بھلا کتا ہو اگر سے سے نکل گیا۔ سعید وچائے لے کر آئی۔ معنی خیز نظروں سے زور تھی کو گھورتے ہوئے چلی گئی۔

”تمہاری سٹیک بار ابھی نہ ماری گئی ہے کوئی کام کی چیز تو ہے ہی نہیں اس میں۔“ قہقہے نے لفظ کھولا اور جو سنریاں لگائیں۔ مدت بعد ہی غم کا ڈر لطف آیا۔

”آپ کا پیسٹر کب کھینے کا؟“ زور تھی نے پوچھا۔

”جب اللہ کی مرضی۔“

”یہ اور ہانگ میں تکلیف تو نہیں محسوس ہوتی؟“ قہقہے نے پوچھا۔

”Pain Killer پر کام چل رہا ہے۔ رات کو سونے کی گولی سے خیر آبادی ہے۔ ان کے جانے کے بعد طبیعت بحال رہی۔ زور تھی اور قہقہے ڈیڑھ سارے دن سائے لے کر آئے تھے۔ میں رسالوں کی ورق گردانی کرتے رہا۔

جب رات کا کھانا آیا تو سعید و کھانا لانے والے کے ساتھ تھی، جب وہ کھانا چھوڑ کر چلا گیا تو سعید و نے پیٹ سے ذائقہ اٹھا کر دیکھا یہ الٹی ہوئی مچھلی تھی۔

”میں آپ کی چارپائی درست کرتی ہوں لیکن کھانا ابھی شروع نہ کریں۔“ وہ جلدی جلدی کام نہانے لگی اور میری پیٹ اٹھا کر اپنے کچھ کسے کمرے سے نکل گئی۔ چند منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئی، پیٹ میرے سامنے رکھی۔

”نیم آنت کیجئے۔“

میں نے اسٹین اٹھایا، میری پیٹ میں ٹرس کی کوئی ذائقہ نہ تھا۔ ٹھپ اور حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور سعید و کے چہرے پر غم مندی کی مسکراہٹ اٹھ اٹھی۔

”جلدی جلدی کھا لیے۔“ اس نے میرا کھینے درست کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ کیا کھاں سے؟“

اس کے بعد سعید و کچھ نہ کچھ لے آئی اور ہم خوب مزے لے لے کر دعوت لڑاتے۔ میں بائیس دن ہسپتال میں رہا۔ میرے پیٹ کا پیسٹر اتر چکا تھا لیکن ہانگ کا پیسٹر بدستور رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن اس نے ہسپتال سے ڈسچارج ہوا تھا۔ میں خوش تھا کہ کم از کم گھر کی آسائش تو میرا ہے گی۔ قہقہے نے چند دن میرے ساتھ رہنے کی جانی بھری تھی۔ اس نے میج آکر مجھے یہاں سے لے لیا تھا۔ ہسپتال میں بدستور خاموشی چھا چکی تھی۔ مریض سو پٹے تھے۔ کبھی کبھی ٹرس کے بال میں چلنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں بدستور Reading Light چلائے پڑھ رہا تھا۔ پردہ سر کا، ”آپ کی راحت دیکھی سو چاہے آپ جاگ رہے ہیں۔“

”سعید و میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں، میں کل جا رہا ہوں۔“

”جی ہاں اب مجھے معلوم ہے۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کی مریضوں کو بھول چکا ہوں۔“

”جی!۔“

دوسرے دن قہقہے کے ہمراہ گھر آیا۔ ذرا کھانک روم کی کھڑکی کے شیشوں پر Welcome Home کا پتھر توڑا ہوا تھا۔ قہقہے کی اہی اور بھانگی نے مجھے خوش آمدید کہا۔ قہقہے کی اہی نے میرا ہاتھ چوما، میری سلامتی کا اللہ کے حضور شکر ادا کیا۔

اس رات ہم نے مل کر خوب مزے مزے کے کھانے کھائے اور قہقہے کی اہی نے مزید کھانے بنا کر میرے فریڈ میں بھی رکھ دیے تھے۔ چائے کے بعد قہقہے، اہی اور بھانگی کو چھوڑنے چلا گیا۔ میں نے فون پر دست داروں اور دوستوں کو گھر آنے کی اطلاع دی۔ سبھی خوش تھے۔ قہقہے کا اور میرا ساتھ خوب رہا۔ وہ مسکاتی چلا جاتا تھا۔ میں وسا کھیوں کی مدد سے پارک میں جا کر گھومتا، ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی میرے لئے گھومنا ضروری ہے لیکن موسم مونا ایسا کرنے کی اجازت نہ دیتا۔

ڈاکٹروں نے میرے پیسٹر کھینے کی تاریخ مقرر کی۔ قہقہے میری خوشی میں دل کا شریک تھا۔ شام کے کھانے کے بعد ہم بی بی ایچ دیکھ رہے تھے، قہقہے صوفے پر نیم ڈالا تھا۔ ایل ویم بڑبڑا کر صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”پیارے تمہارا پیسٹر کھل رہا ہے، کیوں نہ پارٹی کی چاہتے۔“ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فون کی طرف پکا اور اپنی اہی سے پارٹی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

”بھائی میرے اپارٹی جیکسن ہاؤس میں ہو گی۔“ اہی اور بھانگی انتظام کریں گی، ہمیں دوستوں کی لسٹ تیار کرنا ہے۔“

”تمہارے ذہن میں خود ہے، خواہ تو اس سب کو تکلیف دے رہے ہو۔“

”ارے ستورنچ، سالو، غور توں کو ایسے کاموں میں لطف آتا ہے، یہ ان کی تقریب کا سبب ہے۔ کام من کو مصروف رکھتا ہے اور غم توں کو مصروف رہنا چاہیے۔“

”اگر تمہارے اٹھارہ دن تو یہ ہٹو کہ جلد ہی بھی مقرر کی ہے یا نہیں؟“

"تمہارا بیستر بد کو کھینچے گا پارٹی ہفتے کی شام کو۔" میں نے سب کو کہہ دیا ہے۔"
میری تاک کا بیستر آڑا میرے جسم نے جیسے ہڈی کی وجہ سے نہایت حاصل کی۔ مگر اگر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ لب کو Bubble Bath سے لیا اب پھر اللہ رمالہ نے کر ایک لبا غسل کیا۔ پھر ہم نے مل کر چائے پائی۔ شامی کھپ گرم کئے، چائے کے دوران دوستوں کو فون کئے۔ اس شام رات کے کھانے کے بعد میں نے سعید کو فون کیا اور یونی پر تھی۔

"میں نے سوچا آپ مجھے بھول چکے ہیں؟" وہ نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے پارٹی پر آنے کی دعوت دی، وہ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "کیسے تھیں گی، میں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ وہ کیا سوچیں گے؟"

"آپ مجھے جانتی ہیں، آپ قاتل سے مل چکی ہیں۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے؟ یہ تو صرف ہمارا نور تیار دار کا معاملہ ہے۔"

پھر کہا کہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہفتے کی شام کو یونی پر ہو گی۔ میں نے اصرار کیا کہ ہفتے کی شام چھٹی لے اور مجھے فون کرے۔ رات گیارہ بجے کے قریب اس کا فون آیا، اس نے اپنی یونی کسی دوسری نمبر کے ساتھ تہذیبی کر لی تھی۔

پارٹی کے دن بھی شہر میں آئے۔ سب نے میری حالی صحت پر المیہاں کا اظہار کیا۔ پارٹی میں سارے دوست ایک دوسرے سے آشنا تھے لیکن سعید اس گروپ میں انہی تھی۔ میں نے سب کو مخاطب کیا، ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر سعید سے تعارف کر لیا۔

"دوستو! یہ ہیں میری تیار دار۔ ان کے پاس جادو کی چھڑی ہے۔ ہسپتال میں جب میری پیٹ میں الٹی ہوئی تھی آئی تھی تو ان کی جادو کی چھڑی اسے نرمی کو فٹے میں تبدیل کر دیتی تھی۔" وہ اے میں بہ رنگ، بد ذائقہ، بے لکشمی، کبھی ملو، کبھی گلاب چامن میں بڈل جاتا تھا۔ میں ان کا یہ حد منظور ہونی انہوں نے میرے کام وہ ان کو بھی تیار دست رکھا۔ "سب نے تالیاں چائیں۔ سعید و شرماء کو میرے پیچھے چھپ گئی۔

دو ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد میری سٹڈی میں اضافہ لا محالہ تھا۔ قاتل بھی گھر جا چکا تھا۔ کافی سے واپس آکر رات گئے تک سٹڈی میں مصروف رہتا۔ کالج کی جملہ دلچسپیوں سے سراسر کنارہ کشی کر لی تھی لیکن کسی پوری ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے قاتل سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ وہ لالہائی آدمی صرف اتنی تسلی دے سکا کہ اگر اس سسٹم میں سے نہ لیا تو کون سا طور ان آجائے گا۔ فریڈ سٹر۔ اور اس پر غیر سٹیٹ بلڈنگ بہ منظور استوار ہو جائے گی۔ اگلے سسٹم میں کی پوری کر لو گے۔ دن سترہویں سے گزرتا رہا۔ سروس کی لمبی راتیں ختم ہوتی ہیں۔ موسم کی بد حالی نے فضا کو بدلتا دکھائی دیا۔ ہفتے کی رات گئے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ سعید تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے موقع نہ ملا کہ پارٹی کی دعوت کا شکریہ ادا کرتی۔

"آپ کا آنا میرے لئے خوشی کی بات تھا۔ آپ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔"
"یقین کریں، اسے اچھے لوگوں سے مل کر مجھے بہ حد خوشی ہوئی ہے۔ یہ باتیں پارٹی میں گھر میں تھی وہ آپ کے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں پارٹی میرے دوست قاتل کے دوست بھائی جلیل صاحب کے ہیں تھی۔"
"جلیل صاحب نے حد سروسز انہیں ہیں۔ انہیں شاید یہ چل گیا تھا کہ میں کالج سٹوڈنٹ نہیں ہوں۔ ان سے آپ کے دوستوں کو جانتی ہوں۔ انہوں نے ان کی دھم نے خاص طور پر میرا خیال رکھا۔ ان کی دھم کیا کرتی ہیں؟"

"وہ جلیل صاحب کا بھائی ہیں، ایک لٹاکا سے دو نمبر پارٹنر ہیں۔"

"کیا آپ انہیں سے اسلام آباد چلاؤں گے؟" میں منظور ہوں گی۔"

"ضرور ایسا کروں گا۔ میں جانتا ہوں آپ مصروف ہیں، چھ دن ہفتے میں کام کرتی ہیں، وہ بھی تکلیف دہ رات کی ڈیوٹی۔ کبھی وقت نکالیں، نرمی کو فٹے مانگیں۔"

"کوئی اللہ!"

"میں آپ کو فون کروں گا، پھر یہ دکر امہتا نہیں گے۔"

"بہت اچھا، شب خیر!"

طویل عرصہ میں سعید کو فون نہ کر سکا۔ چند ہمارا موقع ملا بھی تو کسی وجہ سے مناسب نہ سمجھا لیکن اس سے ملنے کوئی چاہر ہا تھا۔ کرسمس کی چھٹیاں قریب آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا فون کر کے یہ تو معلوم کروں کہ وہ چھٹیوں میں کیا کرے گی؟ میں نے رات گئے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ انہیں کرسمس میں صرف دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک کرسمس ایو Christmas Eve اور دوسری کرسمس کے دن۔ وہ بھی قسمت سے، سعید و چونکہ مسلمان تھی، اس لئے کرسمس ہائیڈر پر وہ موم کام کرتی تھی۔ میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔ پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیلی فورنیا رشتہ داروں سے ملنے کا مقصد کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کرسمس سے چند دن قبل چھٹی لے رہی ہے، چھٹی کا کوئی خاص مقصد نہیں صرف آرام کر رہا جانتی ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ چند روز ممبر سے چھٹی کی امداد کرے۔۔۔

امتحان کا وہ جو سرت اڑا تو میں نے فراغت کی سائنس لی۔ کیلی فورنیا جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ یونیورسٹی کے بعد ہوتے ہی سارے جاننے والے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس رات میں نے سعید کو فون کیا۔ اس سے دریافت کیا اس کی چھٹی کب سے شروع ہو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی چھٹی پچھلے دن سے شروع ہو گی۔ میں نے اسے پیڑ کی شب کو کھانے پر بلایا۔ وہ چند لمبے خاموش رہی پھر حافی بھری۔ میں نے اسے صبر سے آنے کا راستہ تفصیل سے بتایا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی پچھنے لگی۔ "اور لوگ کہاں ہیں؟"

"اور تو کوئی نہیں آ رہا، صرف قاتل اور ان کی بھانجی کر ہی ہیں، ان کے بھائی جلیل صاحب کو بھی آنا تھا لیکن کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قاتل اس کی بھانجی اور بھانجیاں آ گئے۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سارا دور بے تکلف ماحول کے باوجود سعید و کچھ بھی سمجھتی تھی۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد قاتل کی بھانجی نے قاتل کو چنے کو کہا۔ جلیل صاحب نے واپس لوٹنا تھا وہ آگئی واپس سے پہلے گھر جانا چاہتی تھی۔ ان کے جاتے ہی سعید و نے بھی اجازت چاہی۔

"آپ کو کل چھٹی ہے، اور اچانک مانتے ہیں۔ چائے کے بعد آپ کو چاکر چھوڑ گوں گا۔"

میرے اصرار پر وہ رک گئی۔ چائے کے دوران اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں پاکستان میں؟"

"اپنے گھر" میں نے جواب دیا۔

"اللہ! اللہ! میرا مطلب ہے کون سے شہر میں؟"

"ایبٹ آباد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔"

"ایبٹ آباد کے قریب؟" "وہ جیسے پانا تھی۔" "میری پرورش ہری پور میں ہوئی ہے۔"

"ہری پور۔ آپ میں پانا تھا۔"

"اگر آپ کا تعلق ہری پور سے ہے تو آپ نے ماہنامہ کاہم بنا دیا؟"

"ہاں۔ میری والدہ ماہنامہ سے ہیں" اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے ماننے کی کوشش کر رہی ہے اتنا اتفاق ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔

"ماہنامہ میں آپ کی والدہ کہاں رہتی تھیں؟" میں نے اس کا جھوٹ بکڑنے کی سعی کی۔

"نوباد باغ میں اور آپ؟"

”کوہ باڈ میں۔“ میرا دل اور ذور سے وحز کے نگہ ماسرہ میں شاید ہی کوئی ایسی ٹپکلی ہو جو ہمارے ٹپکلی سے شمار ہو۔

”تسبیح کدہ ری چس یا کوپ نگار ہی ہیں؟“ میں نے حمید کی سے ہم چلا۔
”میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں، لیکن ایسا اتفاق ممکن ہے۔“

اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا کھانا ہوا رنگ دیکھنے سیاحی مائل ہوسر سے ہال، سوزوں رنگ، موٹی موٹی طرحی آنکھیں، مہرچہ رکابی ہوتے، مناسب قدم قامت۔

”تمہاں تھا آپ کا گھر کوہ باڈ میں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن میری ہی جب اپنی بہن سے ملنے جاتی تھیں تو ہم تحصیل کے قریب ان کے گھر پر ٹھہرتے تھے۔ ماسرہ میں مجھ پر باہر لکھنے کی سخت پابندی تھی۔ اور کوپ؟“

”کوہ باڈ میں پہاڑی کے واسطے میں ہمارا گھر ہے۔ جب میرے والد صاحب نے گھر بنایا تھا اس وقت اس پاس کوئی مکان نہ تھا۔ ہمارے مکان کے چپے والا معاملہ ہے جس میں اصطبل ہے۔ صحن خانہ ہے اور پہاڑی ہالے کے لوہے چھوڑا ہے۔ ہمارے مکان سے ذرا بہت کر کوہ باڈ صوبہ کے چھوٹے بھائی کا مکان ہے۔ یہاں اس کے بچے رہتے تھے اور ماسرہ ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ آپ کی والدہ کی بہن ماسرہ میں کیا کرتی ہیں؟“

”وہ تحصیل دار صاحب کے گھر ملازم تھیں اور ان کا خاندان ہسپتال میں ڈرائیو تھا۔“

”آپ کو ماسرہ کتنا یاد ہے؟“

”بالکل معمولی، بس اتنا یاد ہے کہ ہم جامعہ مسجد کے پاس مسوں کے الٹ پر اترتے تھے۔ پہاڑی ہال عبور کر کے بازار سے گزر کر تحصیل کی طرف جاتے تھے، میں بالکل ہموٹی سی تھی، میری ماں مجھے اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر ساتھ ساتھ چلاتی تھیں۔“

”اور آپ کے والد؟“

”مجھے میرا والد بالکل یاد نہیں۔ میں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ بیٹے گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ میں نے اپنے والد صاحب کو بالکل نہیں دیکھا۔ میری یادوں کا سلسلہ بری پور کے محلہ خان سے شروع ہوتا ہے، جہاں میری والدہ محمد سلیم خان کی حویلی میں کام کرتی تھیں۔ میں نے اسی حویلی میں آنکھ کھولی، وہیں تعلیم حاصل کی۔ میری ماں کے خاندان نے ہسپتال کے ذریعے مجھے فرسنگ میں داخلہ دلایا۔ میں نے دو سال لینڈی، یونیٹک ہسپتال چٹاوار میں کام کیا۔ پھر محمد سلیم خان کے رشتہ داروں میں ایک بھائی اذیر تھے، جن کی بدولت میں یہاں آئی۔“

”تو آپ محمد سلیم خان کے رشتہ داروں کے ساتھ رہ رہی ہیں؟“

”نہیں۔ ہسپتال کے پاس ایک پارٹمنٹ بلڈنگ ہے، ہم تین لڑکیاں مل کر اس پارٹمنٹ میں رہتی ہیں۔ محمد سلیم خان کے رشتہ داروں سے کبھی کبھی ملتی ہوں۔ وہ سارے کے سارے بے حد مصروف ہیں۔ ان کے دو گیس انجینئرز ہیں جو پورے کھٹے کھٹے رہتے ہیں۔ دو یا تین کروڑری اسٹورڈ ہیں۔“

جب سعیدہ کو اس کے اپارٹمنٹ میں پھوڑ کر لوٹ رہا تھا تو نہ جانے کیوں بار بار میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ سعیدہ کوپ نگار ہی ہے یا اپنے آپ کو چھپانے کی سعی کر رہی ہے۔ اس کے بیان کردہ واقعات ایک مربوط کہانی سی لیکن اصلیت کہاں ہے؟ اس کا امریکہ آنا بھی قابل غور ہے۔ پھر خیال آتا کہ عطا دینی سے اسے کیا حاصل؟ میرا ذہن دیر تک اس خبیثہ خرافہ میں الجھ رہا۔ جو بھی تھا میرے دل میں اس کیلئے ہمدردی ضرور جاگ اٹھی تھی اور ایک تعلق ماحسوس کرنے لگا تھا۔

کرسمس کی چٹیاں میں نے اپنے ماسوں زاد کے چلار کٹے میں گزاریں۔ وہ کٹے کا ٹھوس صورت ظہور کٹے پوچھ رشتی کی وجہ سے مادی دنیا میں مشہور ہے اور اس کی شہرت کی دوسری وجہ امریکہ کی فنی نسلوں کی ایجاد کردہ تحریریں ہیں جو کٹے میں ختم لیتی ہیں اور پھر دھیرے دھیرے دنیا بھر کے نوجوان طبقے میں رایت کر جاتی ہیں۔ آج بھی کٹے پوچھ رشتی کے سامنے نیلی گرافٹ شریعت پر بے گھر بے لڑکے لڑکیاں ساریز واک پر دنیا کے سارے ٹکڑوں سے بے نیاز دھرم دانت بٹھے رہتے ہیں۔ ان کے بال بھات بھات کے رنگوں سے رنگیں، ان کی ناگوں، دکاؤں، دھونوں، ابلان اور ناف سے بسکے ڈیڑا، ات بھولتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے جوبہ روزگار نوادرات اور بلیڈ از قیاس آئل اور وائر ٹکڑیوں سے لکڑی کے سال لکڑے ٹائمن آرکس کے مسائل پر لیے لیے مباحث میں مصروف رہتے ہیں۔ اس حقوق کی بے نیازی قابل دید ہے۔

ہر کٹے کے ہر گھر کی کھڑکی میں نوادرات سے مزین رنگین روشنیوں والے کرسمس ٹریز و جلیبت اور مسرت کے علم بردار استار وچ مسرت قبول کے ضامن تھے۔ گھروں میں مسکراہٹوں اور قہقروں سے لبریز علم ہونے والی دعوئیں جاری تھیں۔ بازار، سنوڈ، ہوٹل، کپٹے، ریستورانٹ کرسمس کیرول سے بھوم رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا جہاں لہری سرستی میں ڈوبا ہوا ہے۔

میری کرسمس کی چٹیاں خوشگوار گزریں، بہت سی دھونوں میں شرکت کی، گھر پر بھی آئے دن دھونیں ہوتی رہیں۔ سال نو کی پارٹی پر نور سنی ایونٹ پر منعقد ہوتی۔ ہال میں کوئی دوپہار کے قریب مرد عورتیں جمع تھیں۔ خون خمد کرنے والی سردی کے باوجود لوگ سڑکوں پر واک کے گھروں لے خوش دلی سے سال نو کی آمد کے جھٹکے تھے۔ پڑھنے اور دھماکے سے گنتی شروع کی۔ اس، نو، آٹھ، سات۔ ہر کم ہونے والے سیکنڈ کے ساتھ ساروں کی بھونک میں اضافہ ہوتا گیا۔ تین، دو، ایک پھر چاروں اور پھر کابائے حسین بند ہوئے۔ سناٹاں گونج اٹھیں، عبادتے چھوڑے گئے، دھونوں سرداں نے ش کر پوری قوت سے Noise Mak ers بجائے۔ ایک دوسرے کو گنگے لگایا۔ ایک دوسرے کا منہ چوما۔ شہنشاہ کی بوتلوں سے کارک لڑے۔ جھل مل جھل مل شہنشاہ کے فوارے سے گنگے۔ گھاس پھاس ہونے سال نو کو خوش آمدید کہا گیا۔ ایک دوسرے کو سال نو کی مبارکباد دی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا شہر سرستی میں بھوم رہا ہو۔

کرسمس اور سال نو اختتام کو آیا۔ اب مجھے واپس نیویارک جانا تھا۔ میرا کالج میرا منتظر ہو گا۔ ہر کٹے کی کرسمس سے مسکور نیو جرسی کے ہوائی اڈے پر اترا تو نیویارک بدستور کرسمس کی رعنائیوں کے ساتھ ہلکتا رہا تھا۔ گھر آکر قہقروں کو فون کیا۔ وہ مسرت سے چلا اٹھا۔ ”کس وقت آئے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ تیار ہو نے میں کتنی دیر لگے گی؟ میں نے اسی سے کہہ دیا ہے کہ شان کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ کچھ اور لوگ بھی آ رہے ہیں۔ جلدی پہنچو۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن قہقروں کو کون سمجھائے؟ اس نے جھٹ سے فون ای کو دے دیا۔ انہوں نے باؤلڈز تھلا میں شہریت دیاقت کی۔ ”تو تیار ہو کر جلدی چلے آؤ، ہم انتظار کریں گے۔“ اب ایسی مہربانی سے کون انتظار کرے۔ جلدی جلدی قہقروں کیا، کپڑے بدلے، جب وہاں پہنچا تو گھر مہمانوں سے بھر اپڑا تھا۔ آج قہقروں کی کھانسی کی سانگرہ تھی۔ بس اسی بھانے یہ سانگرہ ایک طرح کا کانس ڈر بھی تھا۔ قہقروں نے مجھے طبع دے لے جا کر سرگوشی کی کہ ”کھانسی نے بہت سی لڑکیوں کو اور ان کی ماؤں کو بلایا ہے۔ سب کی نظر میرا تم پر رہی گی۔ تم تو جانتے ہو کہ میرا خاندان اول درجے کا Match Maker خاندان ہے۔ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ کندہ رہنی چاہیے۔ تمہاری چال وصال اور گفتگو میں ٹھہر کر دیکھنا چاہیے۔ کھانسی سب کو بڑی تھی کہ جاگیر دار خان محمد سلیم خان کا بڑا آدمی ہے۔“

”بچہ مجھے بہ چنگر دے رہا ہے، وہ تمہیں بہ خیال نہیں آتا کہ یہ تمہارا گھر ہے اور لڑکیاں پالنے کی باتیں تمہاری طرف بالکل نہ دیکھیں گی؟“

”میری فکر نہ کرو! میں خان محمد سلیمان خان چاگیر دار کا بیٹا نہیں۔ ایسے مقام پر ہم خاک فیشیوں پر کسی کی نظر کیا گھبرائے گی؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

زبردست پاکستانی دعوت تھی، مزے مزے کے کھانے میز پر سجے تھے۔ سب نے ہی صبر کر کھانا کھایا۔ خوشی دہی سے بائیں کیں۔ کھانے کے بعد میز صاف کی گئی۔ کمرے کی روشنیاں دھبوں کی گئیں۔ پارہی خانے سے سہا سہایا، موسم بھون سے مزین کیک لایا گیا۔ سب نے تائیاں جاکیں Happy Birthday گایا گیا۔ قتل کی بھانگی نے سازش کے پلاؤں کو تھپوں کے لیے ہار کو سنبھالتے ہوئے کیک کا، میاں کھانا، مہار کھانا کے غم سے گونجنے میں نے چپکے سے بھانگی کو مہر کھادونی دیکھ لیا کہ بھی تھکے لائے ہیں سوائے میرے۔

بھانگی نے کمال مرانی سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ”تمہارا ہی میرے لئے تھکا ہے۔“ مہمان رخصت ہونے لگے، قتل اور پچھان بھاگ بھاگ کر ان کے کوٹ اور مظہر اور دین کوٹ لالا کر انہیں دے رہے تھے۔ باب مہمان چلے گئے تو ام چائے لے کر قتل کے کمرے میں چلے گئے۔

”بیٹا اتنا ساری جھڑوا کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں کہ مریض کب آئیں گے؟“ قتل نے شرارت سے کہا۔

”وفا داری میرا استواری والی بات ہے۔ چلیں کم از کم کوئی قیاد کر رہا ہے۔“

میں نے تک مریض کا کمر است اپنی ٹیبلوں کے بارے میں بتایا۔ ملان فرانسکو کی بھرتی ڈوبھی مڑکوں کا ذکر کیا۔ گولڈن گیت بون کی Look Out پر چٹوٹ ہو لڑائی میں کھڑے ہو کر چاکو لٹ پٹے کا ذکر کیا۔ بھرتی کی بے نیاز بھی غلوں کے قہر سے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات گہری ہو رہی تھی، سردی بھاری تھی۔ میں نے اجازت چاہی۔ اسی نے خام طور پر احتیاط سے کار چلانے کی تائید کی۔ میں گھر پہنچا تو ہاتھ دالے تھے۔ ٹیلی فون کی Message Light اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ یہ سعید کا پیغام تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔ بہت خوش ہوئی۔ میری چٹیلوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے اس کی چٹیلوں کے بارے میں پوچھا۔

”کہنے لگی، ”کچھ شاپنگ کی، کمرے کی صفائی کی، کچھ کھانے کھائے۔“

”اگر کس ہارٹی میں نہیں گئیں؟“

”نہیں تو اگر کس ایو اور کمرے سے وہ نونوں ڈیوٹی پر رہی۔ البتہ کمرے سے پہلے جو ہسپتال کی کمر کس ہارٹی تھی اس میں گئی تھی۔ ہمارے مٹنے کے کمرے کا شاہکار پر وگرام توں کیا۔“

”اور کیا کیا؟“ میں نے سلسلہ کھنگھری دیکھنے کی سعی کی۔

”گھر کیا میں جی لو اس دیا مجھے کمرے میں نہانی کا سامان زیادہ ہو رہا ہے سارا شرم و لہجہ کی جتا ہے۔ لوگ ہر جگہ خوشی سے بھونٹے نظر آتے ہیں لیکن یہ خوشی شاید میری نہیں۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ میری دھم دھم بھی سنواری ٹیلی فون کے گرد مٹا لاتی، مٹتا ہے کہ کوئی فون کر کے انہیں بلائے۔ وہ بے طرح مہر و ف رہتی ہیں، اور۔۔۔ اور آپ بھی نہ تھے۔ قتل صاحب کو فون کر کے آپ کے آنے کی تاریخ پوچھ رہی تھی۔“ وہ غامض ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ نہانی خصوصیات کر رہی ہے۔ اسے کس سے باتیں کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کی ڈیوٹی آج یہ ستور ساتھی ہے ختم ہو لے والی تھی۔

”کل تمہاری چٹیلی ہے؟“ میں نے دریافت کیا

”ہی۔“

”تو کل نہ گئی کوئی خط لکھ دیتا کیا جائے؟“

”کوئی اللہ۔۔۔ آپ کو نہ گئی کوئی خط لکھ دیتا کیا جائے؟“

”بالکل یاد ہیں اور کل نہ گئی کوئی خط لکھ دیتا کیا جائے؟“

”اور ماسکوں کے سرسوں کے ساگ اور جوار کی روٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے شرارت سے ہنس کر کہا۔

”اور لسی؟“

”کوئی اللہ۔۔۔ اس سردی میں لسی، میرے تو جسم میں کھچکی دوڑ گئی ہے۔“

”ساگ یا نہ گئی کوئی خط لکھ دیتا کیا جائے؟“ میں نے کہا۔

”یہ مجھ پر چھوڑ دو، میں مدد دیتا کرتا ہوں گی۔“

”تو میں کیا کروں گا؟“

”آپ سلام دعا کریں، بلازار سے گلاب جاسن لائیں اور میں!“

”منظور؟“ میں نے نعرہ لگایا۔ ”آپ کس وقت آئیں گی؟“

”سات بجے ٹھیک رہے گا؟“ ”میں آتا ہوں گا۔“ آپ کو لینے؟

”اتنی تکلیف؟“

”تو میں آپ کو کتہ حوں پر اٹھا کر تھوڑا ہی لاؤں گا۔“

”اچھا تو سات بجے۔“

”شو فر حاضر ہو جائے گا۔“

”کوئی اللہ، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ خدا اچھا ہے۔“

”شب خیر!“

”شب خیر!“

یہ سنی ہارٹی میں سات بجے سے چند منٹ بعد میں سعید کے پارٹمنٹ پہنچا۔ میں قیہ کر لیا تھا کہ اوپر نہیں جاؤں گا۔

میں نے گھنٹی جانی۔ Intercom پر بتایا۔ سعید نے گر بخوشی کا اظہار کیا۔ اوپر آئے کو کہا۔ لیکن میں نے ہارنگ کا بیان کر کے اسے جلدی پیچھے آئے کو کہا۔ دو تین دنوں سے قہقہے اٹھانے مشکل وقت سے تھی۔ میں نے بھاگ کر سامان اس سے لے لیا۔ سرخ اور کوٹ اور بالوں میں نمایاں ہو گئے وہ بھی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے جسم سے قیمتی پر لہجہ کی خوشبو فرحت بخش تھی۔

”آپ نے کتنے نوکوں کو کھانے پر بلایا ہے؟“ میں نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم نے سامان کار میں رکھا اور نیویارک کی بے پایاں ٹریفک کا درد من گھڑے میں نے ایک مقام پر لین تھوڑی کی تو سعید نے دھڑکتے سے کہا۔ ”احتیاط ہے۔“

”ایک تجربہ کار ٹریس کی موجودگی میں مجھے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا۔“

”اگر ٹریس ڈیوٹی ہو گئی تو۔۔۔؟“ اس نے اپنی آنکھیں بھڑکھڑا کر کے کہا۔

”لو۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو ضرور احتیاط کرنا لازمی ہے ورنہ بہت سے مریض دہرا نہ گئی کوئی کس سے عزم ہو جائیں گے۔“

”ٹرگسی کو فتنے تو صرف خاص خاص مریض کیلئے ہی پکتے ہیں۔“

پارٹمنٹ میں آکر سعید نے کوٹ ایئر گز مٹانے پر کہا۔ وہ بٹن کھانی پلٹ موت میں بیویں تھی۔ بال قریب سے ہمارے کھے تھے۔ بالوں میں سرخ ہو چرے پر ہکا بکا میک اپ، ہر قوم کی دھیمی دھیمی خوشبو اور نہ نونوں پر مہربان مسکراہٹ کے ساتھ وہ مسرور اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ ہم نے کھانے کا سامان کچن میں رکھا۔

”یہ روسٹرو منظر ہے یہ بائیکر دوپو ہے، اس رات میں سلور ویٹر ہے، چٹیلیں ریبا ہیں، گھاس

لاہور والی شلف پر ہیں۔"

سبس آپ جا کر ذرا تنگ دھم میں بیٹھے، میں میز لگاتی ہوں۔"

"میں جی آپ نہیں ہو تنگ۔ میں نے آپ کو بلایا ہے۔ کھانا بھی آپ پکائی اور یہاں بھی آپ کام کریں۔ یہ کابل قبول شاید نہ ہو۔"

"میں نہیں جیسے اس کا تجربہ ہے۔ اب آپ جا کر ذرا تنگ دھم میں بیٹھیں۔ لی دی، کیسے جس طرح ہسپتال میں کرتے تھے اور میں اسی طرح کھانا لگا کر آپ کو بلاؤں گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی، لیکن مجھے غفلت محسوس ہو رہی ہے۔"

"کوئی غفلت نہ محسوس کریں۔ پلیس۔"

اس نے میز بازو پکڑ کر باہر ہتی خانے سے نکال دیا۔ ذرا تنگ دھم میں آکر میں اپنی ٹانگ سے پیڑا ہارنے لگا۔ سعیدہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی، وہ ہنس کر بولی، ٹانگ میں لگی لوسٹ کی پلیٹ سردی میں سرد ہو جاتی ہے نا؟"

"ہی ہاں آپ کی مریانی سے اس نے پیڑا لگا کر باہر جاتا ہوں۔"

"سبس گرہر نہیں، جھڑے کی بات نہیں۔"

"میں بس فرسوں والی زبان مجھ پر لورن آؤں گی۔" وہ مسکرا کر باہر ہتی خانے میں دوپٹ ش ہو گئی۔

سعیدہ نے قریب سے میز لگائی، پلاؤ، ساگ، ترکسی کو سفٹ، مان پٹنی، سلاو میز بھر پور اور

اشتہا انگیز لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی لائی لائی انگلیوں سے کھانا میری پلیٹ میں ڈال کر دیا۔

کھانے کے دوران وہ خوش دلی سے بات بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کے وقت مویوں کی

طرح بتو کا اٹھتے تھے۔ اس کی مونی مونی شہریتیں آنکھیں خوب لگتا تھیں۔ کھانے کے بعد

اس نے غلاست سے قبوے کی پانی میرے سامنے رکھی اور میرے ساتھ مونی پر بیٹھ گئی۔

بارش کا تسلسل اور ہوا کے پھرنے سے میرے رچے رچے کھڑکیوں کے شیشوں سے لگرا

رہتے تھے، گرم کرنے کی آسودگی، سعیدہ کے جسم سے اٹھتی بھٹی بھٹی خوشبو اور قبوے

کی نئی ماحول کو خدار آلودہ کر رہی تھی۔ اس کی لائی لائی انگلیوں کا لمس جیسے ماحول کو سہلانے

لگتیں۔ شاخوں پر ٹھنڈے پھل کے ٹھونڈے دھیرے دھیرے پھٹنے لگے، نمایاں انگڑائی لے کر

چمک اٹھیں۔ پھول کی چٹیاں بھر کر میرے ہونٹوں پر ٹھہر گئیں، میرے چادر ہاں اور

بھنورے سے منڈلانے لگے، خوبصورت پروں والے پرندے مسین مسین آواز میں گانے لگے۔

دھنک، طعاس، دور کہیں ابھرتی ذہنی موسیقی۔ جیل کے درختوں میں سرسراہٹیں سریلی ہوا

ساتھ نظر پھیلے ہوئے دواہوں کے بے دماغ سہارے کی شکل سبک بادلوں میں ابھرتی اور جی نیم

گرم ہوا کی لوری، گرم اور گرمی رات سکون کی پابیوں پر سر رکھ کر مدہوش ہو گئی، سناٹا اور لہائی

سے چادر ہاں اور آگے ٹھہر گیا۔

میں نے اپنے کانوں پر نرم نرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ اس کی سانس میری گردن کو چھو

رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں، اس کی مونی مونی، منور شہریتیں آنکھیں مجھ

پر پڑی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "ماشاء اللہ چاہیے۔"

اگلے دن کافی بیک پر تھیں نے کہا۔ "ایسا کیوں ہے کہ گرہر سس کی چھینوں کے دن مختصر

ہوتے ہیں اور کافی کے دن طویل۔؟"

"تم لاء کے طالب علم ہو، تم اس قانون کی موافقانی کرو۔ تمہارے چچا غالب نے کہا ہے

"گرہر آگے چلے جاتے ہیں، مگر سال منہ لیب۔"

"آج کل تمہارے چہرے پر شاعری کی توضیحات رہی ہیں۔ کیا بات ہے۔؟"

"سب کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہیں۔"

قتیل نے ہاتھ جوڑ کر کہیں میز پر ٹپک کر ہر جھکا کر کہا "لو لارڈ، تو ہی بھی ہوتی بھیڑوں کو

دراہ راست چلا۔" پھر سعیدہ ہو گیا "بہت سا دھم دھک کرنا ہے۔ تمہارا پارٹنر منٹ یا

میرا لکڑا؟"

"میرا پارٹنر منٹ؟" ہم نے کتلیاں نیٹھالیں اور سب سے کارخ کیا۔

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر آئی۔

چاپنی خانم کا کھانا آیا۔ چاپنی خانم کا کھانا صرف اہم موقعوں پر آتا تھا۔ کھانا گرہروں کی چھین

میں ضرور آتا ہو گا۔ میرے والد صاحب کا سالانہ قلم کاٹاں کے سارے سارے سارے آ رہے

تھے۔ مسجد کے امام صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ قسم قرآن ہو گا۔ میرے والد صاحب کی قبر

پر دو گئیں چھائی چاپنی کی۔ شہر کے معززین بھی شہریت لائیں گے۔ اس لئے میرے لوہاں ہونا

لازم ہے۔"

عظم پڑھنے کے بعد پاکستان جانے کی شعور کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں نے سعیدہ کو پاکستان

جانے کے بارے میں بتایا۔ اس نے اس کو ہر گز میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے بہت

سی کہا یاں کہ اہلیں اور میری کوتاہی پر میری کرخت مضبوط ہوتی چلی گئی۔

اسلام آباد کے ہوائی لڑے پر بس سے رشتہ دار اور احباب جمع تھے، سب سے گلے مل کر اس

گرہر شہر کا سردار ملا جو نیو یارک کے Concrete Jungle میں پیدا ہوا تھا۔ جب وہاں کی

کار میں ماسٹر کے بارہاں میں داخل ہوئیں تو کاندھلوں نے آگے بڑھ کر ہاتھ دلا دیا کہ سلام

کئے۔ سب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مدت بعد اپنے چھین کی یادوں کے بحر مت کی

طرف مڑا ہوا تھا۔ وہ بے ضرر خاموش چھاڑی ہال، وہ جیل کے لوٹے لوٹے درخت، وہ چابی

پچھائی پھاڑی، وہ ست درختوں کے درخت، وہ دوائے پر چاپنی خانم قرآن اٹھانے لگتی تھیں،

میں قرآن کے سامنے میں گھر داخل ہوا۔ گھر میں کام کرنے والی لڑکیاں بھاگ بھاگ کر

چیزیں درست کر رہی تھیں، شہر ماسٹر کا خانہ کی سلام علیکم، خانہ کی سلام علیکم کہہ رہی

تھیں۔ بڑے گھرے میں چائے کا بندہ دست تھا۔ کمرہ جانے والوں سے گھر اٹھ سب کی

آنکھوں میں سوال تھے۔ کبھی نیو یارک کی چادر بھری زندگی کو کسی روزان سے دیکھنے کے

مشاق تھے۔ میں ہنس کر بھیگی کی دل چوٹی کا سالانہ کر رہا تھا۔ کبھی میرے ایکسٹنٹ کی

خبر سے منتظر تھے۔ میرے بڑے بھائی ڈیٹان خان بھاری شلو اور قبضے، مونی مونی کر دست

موسیقیوں والے چہرے کے ساتھ بڑے باوقار لگ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ

میرے بھائی کا ہوائی اشارہ قانون کی طرح اٹل تھا۔ وہ خاندان اور منزل میں کی زندگیوں کے

سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ چائے ختم کر کے میں اپنے گھر سے میں تھوڑی دیر آرام کرنے چلا

گیا۔ میرا چمک، میری کتابیں اسی ترتیب سے رکھی تھیں۔ حویلی میں خوب روشنی تھی۔ کل

میرے لبا کا سالانہ تھا۔ مجھے سارا دن بھائی جان کے ساتھ بہت سے لوگوں سے بات چیت ملانے

تھے۔ ان کے دکھ درد سننے تھے، نیو یارک کے بارے میں بار بار باتیں دہرائی تھیں۔ میں

کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ لپٹا کچھ خیال آیا کہ سعیدہ کی ماں نہیں کہیں رہتی ہو گی۔

اس کے والد سے گئے پھر لوٹ کر آئے؟ اپنی بیٹی کو دیکھا تو نہیں؟ چائے اس کے والد کا نام

کیا تھا۔ میں نے تو اس کی والدہ کا نام بھی نہ پوچھا تھا۔

چاپنی خانم کو گھر کے ہر خاندان کا پورا پورا علم تھا۔ وہ گاؤں کے سارے سارے مزارعوں کے شجر و

نسب سے حافی واقف تھیں۔ ان کو ضرور معلوم ہو گا کہ سعیدہ کی ماں کہاں رہتی تھیں؟ میں

چاہتا تھا کہ واپس جا کر سعیدہ کو اس کے خاندان کے بارے میں مزید معلومات دوں۔ یقیناً وہ

خوش ہو گی۔ اور میرے ذہن میں جو ہلکی سی الجھن ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔

چاپنی خانم نے آکر مجھے دیکھا، شام ہو رہی تھی دوسرا نے چائے پر میرے منتظر تھے۔ چائے

کے دوران ایک بار پھر ساری توجہ مجھ پر رہی۔ بار بار مجھے ایکسٹنٹ کے بارے میں تفصیلات

بتا رہی تھیں۔ چائے کے بعد بھائی جان نے کہا باہر جا کر لوگوں سے مل لو، ہمارا مصلحت خانہ

مصلحتوں سے گھر اٹھتا۔ سب نے اٹھ کر مجھ سے بات چیت ملانے۔ بڑے بڑے مصلحتوں سے سر پہا تھا

بھیر کی دعائیں دیں۔ میرے لبا کی بے وقت موت پر اظہارِ حال کیا۔ بھائی جان کے حسن انتظام کو سراہا۔ بھائی جان کی تعریف سرسری شہد کی نظر تھی۔ بھائی جان تحریری کلمات میں کہ مزید غور سے سر ہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بھائی جان چلی اتار کر مجھے سے ٹپک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مزار سے چارپائی کے گرد زمین پر بیٹھ گئے۔ مجھے یہ طور طریقہ پسند نہ آیا لیکن یہ ہمارا کلچر تھا۔ بھائی جان نے بے کو بلائی۔ بچہ ہمارا اب لا لازم تھا۔ اس کا ہم وکتہ تھا لیکن بے کے ہم سے مشورہ تھا۔ چوڑے چہرے، دراز قد، مضبوط شانوں والا بچا اپنی لالہ والہ تھی کو لہر اٹا ہوا لہا لہا ہوا۔ بھائی جان نے بے کے مولوی صاحبان کے بارے میں دریافت کیا۔ بے نے بتایا کہ مولوی صاحب صحیح کج آجائیں گے۔ قرآن خوانی ٹھیک دس بجے شروع ہو گی۔ بارہ بجوں نے سارا سامان لا کر رکھ دیا ہے۔ بکرے بھی آگئے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا ہے کہ وہ غزوہ ہجرے طہال کریں گے۔ بچہ قصبات بتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ بھائی جان کی باتیں بھی دہار رہا تھا۔ بھائی جان کی یہ شانہ دارا مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن میں گری کیا کیا کرتا تھا؟ صدیوں کا جھگڑا ہوا فرسودہ معاشرہ بدستور فرسودہ اہواں پر رنگ رہا تھا اور ہم سارے اس کے ذمہ دار تھے۔

دوسرے دن صبح صبح لحاظ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ بکرے دوہاؤں سے بچا رہے تھے۔ بے اور حم چارہ بے تھے۔ وہ بے کوئیوں میں بیٹھ جانے اور کروے تباہی کی فلم کے سس لگا رہے تھے۔ اصل رہنمائی شیشوں والی قیوں سے خوشبودار نسوار کی چنگیاں من میں دبا کر تھوک رہے تھے اور اپنے جوانوں کے ہر ایک مستقبل پر تدارک خیال کر رہے تھے۔ میں باہر آیا تو بھائی جان بے ہوئے چنگ پر غم ورلا تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے تعین کی تھی کہ میں سدا وقت ان کے ساتھ رہوں۔ تاکہ لوگوں کو اس میں رہے کہ ہم دونوں بھائی یک جان ہیں۔ مولوی صاحب نے آکر مجھ سے معاملہ کیا۔ بھائی جان سے بکرے طہال کرنے کی اجازت چاہی۔ مولوی صاحب نے بکرے کو بے سبب سے دھاک دینے باتھ دے دی۔ پھر بکروں کو شیشوں والے سے منہ کر مہارت سے ان کی کھالیں اٹھائی گئیں۔ مولوی صاحب بکروں کے چاروں طرف گھوم گھوم کر پڑا پڑا کچھ بچہ رکھ رہے تھے۔ دوسری طرف چارلی کی دی دی دی چٹائیاں بھائی گئیں تھیں۔ جہاں قرآن خوانی ہونے والی تھی۔ میرے لبا کی کا سالانہ کسی بزرگ کے حرم سے کہنہ تھا۔ میں مزار میں گونہا کی قبر کے سیدھے کوچے دیکھ کر لرز اٹھا۔ بھائی جان قبر کے پاس کی طرف چہرے پر بھائی انفرادی لئے میرے سر پر بیٹھ تھے۔ لوگ بھاری بھاری آکر افسوس کر رہے تھے۔ بھائی جان سر کی خفیف جنبش سے ان کے اظہارِ افسوس کو قبولیت قرار دے رہے تھے۔ دوپہر: محل چلی تھی، اٹلیں آگئی تھیں۔ بھائی جان کیلئے ایک طبقہ میں گوشت کے مومے موٹے تھے اور پٹاوا لائے گئے۔ انہوں نے بے اعتباری سے پٹاواں کے چند دانے من میں ڈالے اور سر ہلا کر تقسیم کا حکم جاری کیا۔ لوگ، بکروں کے گرد جمع ہو کر تقسیم کا کام کرنے لگے۔ بھائی جان نے مجھے کھر جانے کا اشارہ کیا۔ بکروں کا کھانا مزار میں، مولوی صاحبان اور ملازمین کے پٹاواں اور شہر کے پیرو چیدہ گھر جوں میں تقسیم ہونا تھا۔ خاندان کے لوگوں اور اہم سرکاری افسران والا کیلئے کھانا گھر میں تیار کیا گیا تھا۔

ذہنی مشر صاحب کے آگے ہی کھانا مردانہ خاندان میں لگایا گیا، میرے خوشامد پسند بھائی اب سرکار افسران بالا کی خوشامد میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو ہرگز مرنے والے خاندان محمد سلیمان خان، جاگیر دار نہ تھے۔ بے موضوع گفتگو اور انہی کے اظہارِ درجائی مقدمات، سب کو ان کی تعمیر کے لیے اور جنگلات کی کٹائی تھا۔

وہ ان ہی سرگم الٹی میں گزرتے۔ جب سارے مزار سے جا چکے تو ذرا سبکوں میرا تپا۔ مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ میں اس معاشرے والا نہ سمجھتا ہوں اس ظور غروب کا حصہ نہ تھا۔

پہلائی دینے کا چہرہ تراشی میرا از دہاں رہا۔ میں سب سے آنکھ چاکر کتاب لے کر پھتری کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ دے میں تھری لٹکوں اور دن میں کو تیرتا دیکھتا رہتا تھا۔ دو شاپر اور شیم پر دندہ دانتے بد نماڑک اور بد صورت لاریوں کی آسودہ گز گزلیٹ سنا رہتا۔ میرا اپنی جلد از جلد نیویارک جانے کو چاہ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں آکر میں اپنا آپ کھو رہا ہوں۔ لیکن مجھے کم از کم ایک ماہ یہاں ٹھہرنا تھا۔ پھر خیال آتا کہ یہ بہتری بلا وجہ ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہ میری مٹی ہے۔ یہاں میرے لبا کی اور میری ماں جی د لہن ہیں۔ میں اس جائیداد کا وارث ہوں۔ نیویارک میں میرا کون ہے؟ دراصل میں وہاں انجمنی ہوں۔ پھر مجھے سعید کا خیال بھی آتا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ گھر بیٹھے ہی خط لکھئے۔ "میں انتظار کروں گی۔"

ایک شام کا میرے لئے چائے لے کر چوتھے پر تپا۔ میں نے اسے پیئے کو کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ نیویارک میں میں جس ہسپتال میں تھا وہاں میری نرس جو تھی وہ پاکستانی تھی۔

"نیویارک کے بے ہسپتال میں پاکستانی نرس؟" بچہ بچا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔

"ہاں وہاں بہت سے پاکستانی تبار ہیں۔ میری نرس کا نام سعیدہ ہے۔"

"سرکار آج کل تو ساری دنیا میں پاکستانی پھیلے ہوئے ہیں۔"

"لیکن بدکت، اس کی ماں ماحسودہ میں رہتی تھی، تحصیل کے پاس۔"

"ہاں ہی ہوگی" بے کی لاشعری نے مجھے خامہ مایوس کیا۔

"بے سرکار آ رہے ہیں۔" بچہ اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ بھائی جان کمر کے چھ باندھے ہاتھ سے

چوتھے کی طرف آ رہے تھے، انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور میرے ساتھ بیٹھ گئے۔

"یہ کیا کیا بک رہا ہے؟" انہوں نے مذاقاً کہا۔ بچہ مسکراتا ہوا ان کیلئے چائے دے لگا۔ بھائی

جان نے بے کو رخصت دی اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"سیدہ کے امیر محمد خان کی بیٹی کے بارے میں چاہتی خانم نے کئی بار کہا ہے کہ تم سے

بات کروں۔ امیر محمد خان اور ہمارے جنگلات کا علاقہ ضلع بالا کوٹ میں ساتھ ساتھ ہے۔

امیر محمد خان خاندانی رئیس ہیں۔ ان کی بیٹی سرین فرخ پھر کالج پشاور میں پڑھاتی ہے۔ اس

کے دونوں بھائی انگلینڈ میں ہیں۔ سلجے ہوئے لوگ ہیں۔ چاہی خانم اور تمہاری بھانجی کی

مرنسی ہے کہ ان سے رشتے کی بات کی جائے؟" بھائی جان سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے

لگے۔

"بھائی جان! البتہ ان کے بعد آپ میرے بڑے ہیں۔ چاہی خانم کا میرے دل میں بے حد

احترام ہے لیکن اس بارے میں اقرار یا انکار کرنا اس وقت میرے لئے دشوار ہے۔ مجھے تعلیم

تھمل کرنا۔" بھائی جان نے میری بات کا تہہ دی۔ "تو بے حد دُعا تمہیں کون کل شادی

کرنے کا کر رہا ہے۔ ہم صرف ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

ہم دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ "خلاصاً بھائی جان! اس وقت کسی قسم کا فیصلہ مجھے عقل

از وقت لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ بھائی جان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے تم چاہی

خانم سے بات کرو۔ ان کو بلائے پاس بیٹھ سے جانے کی تیار یاں کر رہی ہیں۔"

"چاہی خانم کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی ہماری اکی بھال میں

صرف کر دی۔ ہمیں چوں کی طرح پالا۔ نہ شادی کی، نہ خوند کی رفاقت سے ہمکار

ہوئیں۔"

"درست ہے" بھائی جان نے۔ "لیکن یہاں سے لہاجی نے بھی ان کی صحبت کا حق ادا کیا۔ ہماری

اماں جی کی زندگی میں بھی چاہی خانم کو بہت سے خاندان میں عرق آخر کی حیثیت حاصل تھی

اور اب بھی ہے۔ جو بات ان کے ہونٹوں سے نکلتی ہے میں فرمانبرداری سے چاہ کر رہا ہوں۔

وہ ہمارے گھر کے سیاہ سپید کی مالک ہیں۔" انہوں نے چائے کی چمکی لی۔

"انہوں نے نہ خام نہ دیکھا نہ اور نہ کبھی۔ اپنی زندگی اپنی بولی کی ساری مزاحیہ اس گھر سے پر تھا اور گدی ہے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں بھائی جان!"

"مگر میں درست کہہ رہا ہوں تو تمہیں اندازہ ہے کہ اس بات کو رد کرنے سے انہیں کتنا گرا دکھ ہو گا؟" بھائی جان کی آواز جذباتی تھی۔ میں اس اچانک طے کیلئے تیار نہ تھا۔ ہم دونوں دم تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بھائی جان نے خود ہی گفتگو کا موضوع بدلا۔

"تیس سال پہلے جو گاؤں گزشتہ سال دیہات میں سیلاب آیا تھا۔ ہدیاری کے پاس کڑی فصلیں زیرِ قب آگئیں۔ کچے مکان ریت کے گھر و گدوں کی طرح کچھل گئے۔ خانہ پانی میں بہہ گئے۔ خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ افراد تقری تھے، اس سال وہاں فصل نہ اگا سکے۔ ان کے پاس کھانے کو نہ تھا۔ حکومت نے جو رقم دے کر اعلان کیا ہے وہ ان تک پہنچنے پہنچنے وڑاؤ کی کو فیوں اور ہری پور کے گسترین خاندان کا حصہ ہی کیونکہ گسترین خاندان کے افراد نے یہ رقم تقسیم کرنا تھی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ وہاں زمین چنے پر راضی ہیں۔ تحصیل دار صاحب نے مجھے خاص طور پر آکر اطلاع دی ہے۔ موقع اچھا ہے، میرا خیال ہے ہم وہاں جا کر علاقہ دیکھ لیں۔"

"تو ان دو چٹانوں کا کیا ہے گا؟" میں نے سوال اٹھایا۔

"کیا ہے گا؟ رقم ان کے ہاتھ پر رکھیں گے اور وہ اعلیٰ کریں گے۔"

"انہوں نے اپنی ساری زندگی اس زمین پر اپنا خون پیٹہ پھڑکا اور آپ انہیں چند لکھوں میں بے دخل کر دیں گے؟"

بھائی جان نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "تو پور کیا؟"

حوالی سے ایک نئی بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ جب ترے کے پاس رگ کر اپنی جتنی خاکھارا من میں دیا کہ شرماتی ہوئی کہنے لگی۔ "بی بی جی نے آپ کو اندر بلا دیا ہے۔" بھائی جان نے حسبِ عادت سر ہلایا۔

میں نے کمرے میں میری بڑی بہن خور شید، ان کے خاوند اور بیس خانی (جو فارمٹ ڈیپارٹمنٹ میں کوئی ڈائریکٹر و فیروز تھے) اور چند اور قریبی رشتے دار بیٹھے تھے۔ ہمارے نالغے ہی چاہی خاتمہ لیں۔

"امیر محمد خان کے گھر سے جواب آیا ہے۔ انہوں نے ہم سب کو کھانے پر بلا دیا ہے۔ میں نے ہاں کر دی ہے۔ کل ہم سعید نے چائیں گے۔"

چاہی خاتمہ کا حرف آخر پتھر پر لکھ رہی تھی۔ کوئی کچھ نہ بولا اور نہ ہی ہونے کی ضرورت تھی۔ آخر کار بھائی جان بولے۔

"چاہی شان کی مرضی پوچھ لیں۔"

"اس میں مرضی پوچھنے کی کیا بات ہے ایسا موقع ہر بار نہیں آتا۔"

پتھر پر ایک اور تصویر نمودار ہوئی۔

"چاہی مجھے جانے میں بالکل قطعاً کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے وغیرہ کی بات فی الحال نہ پھیلے۔ مجھے ذرا سوچنے کی صلا دیں۔" میں نے کہا۔

"ہم نے ابھی طرح سوچنا لیا ہے تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

ان دو خاندانوں کا ملاپ بالاکوٹ کے جنگلات پر لکھا اثر انداز ہو گا۔ اور میں خان چیتے ہیں ان سے بات کر لیں۔

"آپ کا کہنا ہے لیکن مجھے خود اس وقت درکار ہے۔"

"خود پارک میں رو کر تم انگریز تو نہیں بن گئے؟" چاہی نے کہا۔ ابھی تو وہ اسامہ مکر لڑے۔ مکرے کی وہ جھل کشیدگی میں کسی حد تک کی واقع ہوئی۔ اور میں خان نے جنگلات کے متعلق

نورنگڑی کی قومیت کے بارے میں میرے علم میں خاطر خواہ اتفاق کیا۔ بھائی جان نے بالا کوٹ میں حویلی تعمیر کرنے کی توجہ بخش کی۔ میں نے مددی باغیں بنیں اور بڑے باتھ لیں۔ باغ و فیض ہوا کہ ہم کل امیر محمد خان کے گھر چائیں گے لیکن بھائی کی بات، جمال انوائس رکھیں گے۔

بائی خود شید نے ایک بار پھر میری ٹانگ کے بارے میں پوچھا اور سب کو مطلع کیا کہ خود پارک کے ڈاکٹروں نے میری ٹانگ کی ہڈی کو لوہے کی ہڈی لگا کر جوڑا ہے۔

"تو وہ ہڈی کہاں ہے؟"

"میری ٹانگ میں۔"

"یہ ہڈی کب تک رہے گی۔"

"ایک سال تک۔" مور توں نے توہ توہ کی۔ موضوع گفتگو چونکہ ہسپتال تھا اس لئے میں نے قیمت جان کر سعید کی والدہ کے بارے میں گریہ نہ کیا۔

"ہسپتال میں میری نرم پاکستانی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں مانسروہ میں ہوں تو وہ بڑی حجب ہوئی، کہنے لگی اس کی ماں بھی مانسروہ سے ہے لیکن اس کی پرورش ہری پور میں ہوئی ہے۔ مانسروہ سے بالکل باہر نہیں۔"

"تو یہ خدا یا کیا اتفاق ہے۔ بالکل ظلموں والی بات ہے۔" بائی خور شید نے فیس کر لیا۔ اس کی ماں کا کیا نام ہے؟"

"یہ معلوم نہیں۔"

"نرس کا کیا نام ہے؟"

"اس کا نام سعیدہ ہے۔ اس کی ماں فوت ہو چکی ہے۔ ایک چچی تھی جو مانسروہ میں رہتی تھی۔ شاید وہ بھی فوت ہو چکی ہے۔"

میں نے کمرے میں کر رہا تھا کہ چاہی خاتمہ کو جیسے اس گفتگو سے انھیں محسوس ہو رہی ہے۔

"اس نرس کی پرورش ہری پور میں ہوئی تھی؟" چاہی نے ہلکے کر سوال کیا۔

"جی ہاں! اس کی ماں وہاں کسی کے ہاں رہتی تھی۔ جاننا تو تھا کہ خاتمہ خان کے ہاں۔"

اچانک چاہی خاتمہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں اور ان کے پیچھے اچھا بھی چلی گئی۔ خور شید، چاہی خاتمہ کی خاص خادمہ تھی۔ دن رات چاہی خاتمہ کے ساتھ سامنے کی طرح لگی رہتی تھی۔

چاہی خاتمہ صرف زکوٰۃ سے مسکرا مسکرا کر پھر کر تھیں۔ زکوٰۃ چاہی خاتمہ کے کمرے میں لٹی سوتی تھی۔ چاہی خاتمہ کے اچانک اٹھ کر پلے جانے سے عادت نہ رہے

مجبور بھی ہوئے لیکن جلد ہی ہم فحش کی باتیں کرنے لگے۔ اچانک بارش ہونے لگی۔ توں نے شور مچانا شروع کیا۔ بائی خور شید نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "سردیاں میں حجب بارش رہتی تھی تو شان میری نہیں کرتے تھے کہ باقی ڈاکھیلیاں چائیں یا نہ؟"

"ہاں! یاد ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ بارش نہ ہو رہی ہے لیکن چلیاں نظر نہیں آ رہیں۔" سب نے ہل کر قہقہہ لگایا۔

سعیدہ کی ماں کے تذکرے پر چاہی خاتمہ کا اچانک کمرے سے نکل چاہا میرے ذہن میں اس وقت سے پیدا کر رہا تھا۔ چاہی خاتمہ کا سعیدہ کی ماں باسعیدہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ سوچا

مناصب وقت پر اچھا سے پوچھنا چاہیے لیکن اچھا چاہی خاتمہ کی گہری رازدار تھی۔ زکوٰۃ چاہی خاتمہ کی مستعد خدیجہ پالیں کا کام بھی کرتی تھی۔ حویلی میں خاتمہ کرنے والے سرد حور تھیں

راز سے قور سے خائف تھے۔ کچھ بھی ہمارا پرانا خادم تھا ہم سارے اس کے ہاتھوں پہنچے ہوئے تھے۔ اگر چاہی خاتمہ نے کھل کر بات نہ کی تو میں نے سب سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

لیکن چاہی خاتمہ سے بات کرنا 1947ء میں موقع کی تاک میں رہا کہ کسی وقت چاہی سے لکھا بات کروں گا۔ چاہی نے میری شکل آسمان کر دی۔ امیر محمد خان کی حکومت کے بعد ایک صحیح

چاہی غلام میرا ہشت لے کر دھونا کے ساتھ میرے گھر سے گئی۔ زنجیر نے میز لگائی اور دھڑک کر چاہی کے قدموں میں چلنے لگا۔

ہاشم کے دور ان انصاف نے امیر خان کے خاندان کی غریبوں کے لیے پناہ دی تھی۔ ان کے سوا کسی دیکھ کر کھانا اور تندی کے بارے میں ایک ایک بات نوٹ کر کے مجھے بتائی۔ مجھ سے وقتاً فوقتاً سوال بھی کرتی رہیں جن کا جواب میں سعادت مندی سے دیتا رہا لیکن زنجیر کی موجودگی میں چاہی سے سعید دیکھنے کے بارے میں بات کرنے سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے زنجیر کو گرم چائے لانے کو کہا۔ جو نئی دورہ اسے سے نکل میں نے بھٹ چاہی سے سوال کیا۔

”جب ہم سعید دیکھنے کے بارے میں بات کر رہے تھے، آپ اپنا تیز تیز قدم اٹھا کر کمرے سے نکل گئیں۔ کیا آپ سعید دیکھنے کے بارے میں جانتی ہیں؟“

چاہی غلام کا رنگ فق ہو گیا، لیکن جلد ہی انصاف نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور غیر جذباتی آواز میں کہا: ”نہیں، کوئی ایسی بات نہیں، میں سعید دیکھنے کی ماں وغیرہ سے بالکل واقف نہیں۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”میں نے پہلے ہی ہے کہ تم اس لڑکی... کیا نام ہے اس کا... سعید سے قطع تعلیق کر لو۔ کیا ہوا جو اس کی ماں شعلہ ہزارہ سے ہے۔ وہاں تمہارے اچھے اچھے دوست ہیں۔ تمہاری تعلیم مقدم ہے۔ تعلیم ختم کر دو اور اگر اپنے بھائی (بھائی کا ہاتھ دھو، وہ اگلا ہے اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں اس کے سر...) تم وہاں آ کر تمہارا گھر آباد ہو، میں یہ خوشی دیکھوں میرا اکلوتا لفظ“

”ہاں۔“

زنجیر چائے ڈالنے لے کر آئی اور میز پر رکھ کر اس پر نیکو زری رکھ دی۔ اسی شام میں نے بے کو ساتھ لیا، ہار میر کر کے ڈاک بنگلے کی طرف چل قدمی کیلئے نکل گئے۔

”تمہیں کالایا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی ہاں، والد جیسے نیک آدمی تھا۔ ساری زندگی حویلی میں ہاتھ دھو دار صاحب کی خدمت میں گزار دی۔“

”اس کا ایک دن بھی ختم...؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں، سرکار نے اسے سکول داخل کر لیا۔ پھر ایسٹ تیار کالج گیا، آج کل محکمہ جنگلات میں کوئی افسر ہے لیکن آپ کا شک نہیں ہوگا۔ جب اسے سرکار کی وفات ہوئی تو ایک دن ایک رات جنگ سے لگ کر بھاگا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”کیا تم ہسپتال میں کام کرنے والے اور انچارج کرتے ہو تھے اس کا ہم بھول گیا وہ بھی اکثر آتا تھا، اب اس سے ملنے، یہ میرے اسلامیہ کالج پشاور جانے سے پہلے کی بات ہے۔“ میں نے چالاکانہ سے ہنسنے لگا۔

”جی ہاں، میرا تھوڑا سا دور بھی چل رہا تھا۔“

”اب کچھ سیری کر فٹ میں تھا۔“

”ہاں یاد آئی، لیکن زنجیر کی بیوی ہار سے ہاں کام کرتی تھی؟“

”نہیں، اس کی بیوی نہیں۔ اس کی...“

”کچھ جیسے تکتے میں آئی۔ میں خاموشی سے چلا۔“

”تم ڈاک بنگلے کے خاندان کو جانتے ہو؟“

”جی انہی طرح۔“

”اسے انہی ہی چاہئے گا کہ...“ میں قہقہے کے درختوں کے جھنڈ میں لڑی چلنے لگا۔

خاندان کے ساتھ مسکرا کر آیا۔ ہلک کر ہاتھ دھو، غیرت پوچھیں اور چائے پینے چلا گیا۔ ہاتھ دھو جانے لگا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

”بھو جھڑکت! میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔“

”جو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں صاف صاف اور دیانتداری سے بتانا ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں بھانک کر کہا۔

”جو حکم کریں سرکار ہم آپ کے تنک خود ہیں۔“

”بدر حسی کی بیوی کی بہن ہار سے ہاں کام کرتی تھی؟“ میں نے دکر رک کر کہا۔

”جی۔“ بے کی آواز نوٹ گئی۔

”اس عورت کی شادی کب ہو کر کہاں ہوئی تھی؟“

”جی۔۔۔ میرے خیال میں اس کی شادی بالکل نہیں ہوئی سرکار!“

”اس کی شادی نہیں ہوئی لیکن وہ ایک لڑکی کی ماں ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بے کی آنکھوں سے آنسو ٹپ پڑے، اس نے اپنی پگڑی کی جھول سے آنکھیں صاف کیں، خاندان چائے لے کر آیا۔“

”سرکار! آپ امریکہ میں ہیں؟“ اس نے سارے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”جی بھو یاد رکھ میں ہوں۔“

”سرکار جب آپ جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں، آپ کی خدمت کر دیا گا۔“

”جی تو بہت چاہتا ہے کہ گھر میں کوئی ہو، کھانا پکائے، صفائی وغیرہ کرے لیکن امریکہ جانے کے قانون ہارے کڑے ہیں۔“

”سرکار! آپ کیلئے کون سے قانون...؟“

خاندان شاید لمبی بات کرنے کی حسیہ باندھ رہا تھا لیکن میری بے رخی دیکھ کر وہیں ہلا گیا۔

میں نے سعی تیز انھوں سے بے کی طرف دیکھا، وہ میری انھوں سے چہچہاتا تھا۔ لیکن ناکام رہا۔

”سرکار! دوپہر طرے دے لگا۔“ یہ بی بی جی کا حکم ہے کہ گھر کی چار دیواری سے یہ بات باہر نہ نکلے۔ اگر بی بی جی کو ظلم ہو گیا تو میرے ہال پہنچا دو جائیں گے۔ میری زندگی ختم ہو جائے گی۔“ وہ بدستور آنکھوں خشک کر رہا۔

”جھڑکت!“ میں نے گھر گھر کر کہا۔ ”یہ بات گھر کی چار دیواری میں ہی رہے گی، میں بھی اس گھر کا فرد ہوں اور ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی۔ میرے ہونٹ اسے کبھی نہ دہرائیں گے۔“

میرے کہنے پر اس کی تھوڑی سی راحت ہو گئی۔

”سرکار!“ اس کی رہائشی آواز میں کہا۔ ”اللہ بڑا اس کا رسول علیہ السلام میرا مددگار ہو۔ میرے والوں کے پیچھے ایسی باتیں کرنا کھانا کبیرہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول میری کوتاہی معاف کریں۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے آپ پر قابو پانے کا وقت دیا۔

”سرکار!“ اس نے طلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس دن بی بی جی نے سوائے میرے اور زنجیر کے سب ملازمین کو بڑے سرکار کے ساتھ چوں سمیت گھوٹن“ اثر“ پر لگایا۔ وہ پھر کے بعد زنجیر کے آکر مجھے کہا کہ بی بی جی بیمار ہیں۔ میں اندر گیا تو سیکڑے فرش پر فٹھی دور ہی تھی۔ اس کے پاس ایک کھڑی پڑی تھی اور بی بی جی کے ہاتھ میں ٹونوں کی گڈی تھی۔ جو وہ اسے دے رہی تھیں۔ حضور سیکڑے سرکار کی خدمت گار تھیں۔ آپ کی والدہ کی وفات کے بعد سیکڑے سرکار کی خدمت کرتی تھیں۔“ وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”یا اللہ! مجھے معاف کرنا۔ یا رسول اللہ! مجھے“ غش“ آیا۔ بی بی جی نے کہا کہ سیکڑے جی پر چارہ ہی ہے۔ اسے لے جائیں میں اٹھاؤں اور جب تک کہیں نہ چلے دیں رہنا۔ پھر بی بی جی سیکڑے سے خطاب ہو گئیں۔ ”اللہ اللہ جی وقت ہمارا ہے اور میں لیا تم نے۔ تم نے وہاں ماںسر کے کا رخ نہیں کرنا۔ اگر مجھے رتی بھر شبہ ہو کہ تم اللہ جی باتیں کر رہی ہو تو مجھ سے لڑاؤ نہ ہوگا۔“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

”جی ہاں، سرکار!“

چیونٹیوں کی قطار

امر محبوب ٹیپو

روشن دان سے کچھ نیچے دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ یہاں سے یہ چیونٹیاں نکلتی ہیں اور پھر نیچے آکر زمین کے قریب ایک اور سوراخ میں حساب ہو جاتی ہیں۔

میراثہ کوئی پانچ فٹ آٹھ انچ ہے، ہاتھ اٹھائیں تو تقریباً سات فٹ کی اونچائی تک پہنچتا ہے، لیکن یہ دروازہ میری پہنچ سے بھی کوئی فٹ بھر اونچی ہے۔ روشن دان سے کوئی چھ انچ نیچے میں نے حساب لگایا ہے کہ اوپر سے نیچے تک یہ چیونٹیاں کوئی آٹھ فٹ کا سفر طے کرتی ہیں۔ وقت کا اندازہ لگانے کیلئے میرے پاس کوئی چیز نہیں جس سے معلوم ہو پائے کہ ایک چیونٹی کی توسط رفتار کیا ہوتی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہیں اوپر سے نیچے تک پہنچنے میں کوئی دس منٹ لگتے ہوں گے۔ پھر سوچتا ہوں کہ وہ سکتا ہے کہ پانچ منٹ میں لگتے ہوں، پانچ یا دس کیا فرق پڑ جائے، وقت کی اہمیت کہاں ہے۔

اگر وقت ذوری کی طرح کی چیز ہوتی تو میں اس کو لہٹھکا دیتا اور ہر اگر کے اس کے کئی حصے کر دیتا۔ جو حصے پسند آتے انہیں رکھتا باقی تمام پھینک دیتا۔ لیکن یہاں تو وقت اپنے کیلئے گزری چاہیے یا کوئی ایسا آلہ جو ایک مستقل رفتار کے ساتھ چلے۔ ایسا کوئی آلہ میرے پاس موجود نہیں۔ لیکن کبھی میں اپنا ہاتھ اٹھاتا ہوں کہ گزری کے چذو لم کی طرف بلائے کی کو نشان کر دے ہوں کہ اس سے وقت کا کوئی اندازہ ہو سکے لیکن پھر جلد ہی تھک جاتا ہوں اور وقت کے گزرنے پر اپنے ہاتھ کے چذو لم کی پابندی چھوڑ دیتا ہوں اور اسے آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔ ”میں آؤ تو نہیں تو کیا، میں نے وقت کو تو آزاد چھوڑا ہوا ہے“ میں سوچتا ہوں۔

کبھی کبھی اپنے ہاتھ کے چذو لم کی مدد سے میں نے چیونٹیوں کی رفتار دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ یا تو چیونٹی پر سے نظر اٹھ جاتی ہے یا پھر ہاتھ کی کتنی بھول گیا۔ صرف وہ وقت یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ مکمل کر پاتا ہوں۔ ایک بار 745 بار میں ایک چیونٹی نیچے تک پہنچ گئی اور دوسری بار 650 مرتبہ میں۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے ہاتھ کی رفتار بدل گئی یا چیونٹیوں کی رفتار بدلتی رہتی ہے۔ چیونٹیاں اوپر سے نیچے تک ایک ہی رفتار میں آتی ہیں۔ خیال ہے کہ کوئی اس سے فکر کر اور پھر اوپر ہو جائے، ان کو لائن میں رکھنے کیلئے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور ان کی کبھی دھمکی کی۔ ایک جگہ سے ایک چیونٹی گزر جائے تو نازم ہے کہ باقی بھی اوپر سے گزریں۔ یہ بات میں نے کئی دن کے مشاہدے کے بعد دریافت کی ہے۔

اب میں اس فکر میں لگا ہوں کہ اندازہ کر پائیں کہ ایک وقت میں اس قطار میں کتنی چیونٹیاں آتی ہیں لیکن یہ بھی آسان کام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک انچ میں کوئی دس یا بارہ چیونٹیاں آتی ہیں۔ اس حد کی جیاور میں صرف اندازہ لگانا ممکن ہوگا کہ چوری قطار میں کتنی آتی ہوں گی۔

یہ چیونٹیوں کی سائنس بھی کیا خوب علم ہے، اس کا اندازہ مجھے ابھی چند روز پہلے ہی ہوا ہے۔

میں اس علم کی نشوونما اس کو ٹھہری کے تمام مذاہب بھول گیا ہوں۔ چند اب سوچتا ہوں کہ باقی کی فہم بھی اسی کو ٹھہری میں گزر جائے تو مجھ پر کتنا رحم ہو گا۔

میں قیدی نمبر 1212 ہوں۔ مجھے اس ٹیل خانے میں اب کوئی بارہ سال ہونے کو آئے ہیں، لیکن پچھلے چھری سب آرائیں سے لڑائی ہو گئی تھی اور میں نے اسے چاقو کا رافٹا۔ اس کی سزا میں وارڈن نے مجھے چالیس دن کیلئے اس اندھیری کو ٹھہری میں بند کر دیا۔ میرے حساب کے مطابق آئی شاید 23 دن ہے۔

ایسے تو میں کب کا ان کٹھن چھوڑ دیتا لیکن ان چیونٹیوں نے میرے تمام اسرار کتبہ مدد سنا سنا دیا ہے۔ یہ چیونٹیاں نکلتی نہیں۔ یہاں تک کہ رات کے گھپ اندھیرے میں بھی میں نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا تو یہ چیونٹیاں مجھے اپنی قطار میں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پھر میں اپنے ہاتھ کو دیوار پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اندھیرے میں ان کے ایسے میں ایک ناگزیر رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔ پر میں نے محسوس کیا ہے کہ کچھ میرے ہاتھ کے اوپر سے کچھ اطراف سے ہوتی ہوئی نیچے چلتی ہیں اور ایک قطار کی صورت میں اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ اس سے مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ اندھیرے میں نہ صرف دیکھ سکتی ہیں بلکہ قطار بھی بنا سکتی ہیں۔ ان کی یہ صلاحیت معلوم کر کے میں دنگ رہ گیا ہوں۔

انہاں میں فوج کے سپاہیوں کے علاوہ شاید ہی کسی اور میں اتنا نظم و ضبط دیکھا گیا ہے۔ لیکن فوجیوں میں بھی کیا نظم و ضبط ہوتا ہے ان کے ہاتھوں سے مدد و قیاسے لو پھر دیکھو کہ کون کس کا کیا کرتا ہے۔

میں نے پچھلے تین ہفتوں میں چیونٹیوں سے بحث نہ کی تھی۔ شاید ہی زندگی میں کسی اور چیز سے کیسا ہو گا۔ جب اس کو ٹھہری سے باہر نکالوں گا تو ضرور ایک بدلا ہوا انسان ہوں گا۔ اس سے اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن مجھے پتا نہیں ہے۔

وقت اپنے کیلئے ایک مستقل رفتار سے چلتی ہوئی چیز چاہیے۔ یہ بات میں نے ان چند ہفتوں میں دریافت کی ہے۔ اس کو ٹھہری میں ایک مستقل رفتار سے چلتی ہوئی چیز صرف یہ چیونٹیوں کی قطار ہے۔ اگر یہ ایک کی تو وقت رک جائے گا۔ پھر اس کو ٹھہری میں تمام چیزیں ساکت ہو جائیں گی۔ موائے میرے، میں وقت کو اپنی مرضی پر چاؤں گا۔ جسے میں ہوں گا تو وقت چلے گا نہیں تو ساکت ہو جائے گا۔

روشن دان کے قریب سے نیچے آنے والی چیونٹیاں ایک مستقل رفتار کے ساتھ چلتی ہیں ان کی اس رفتار کے ساتھ میری زندگی کا نظم و ضبط درست ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہیں۔ جب میں صبح اٹھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ رات بھر میں اس قطار میں بارہ یا تیرہ چیونٹیاں گزر گئی ہیں۔ کیونکہ میں نے پتا نہ لایا ہے کہ ایک گھنٹے میں ایک ہزار چیونٹیاں گزریں یا نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ایک ہزار چیونٹیاں گزر گئیں ہیں تو کہتا ہوں کہ ایک گھنٹہ گزر گیا یا جب میں

بعد میں قیدی نمبر 1242 کی فائل لائی گئی تو پتہ چلا کہ یہ قیدی آزادی و جمہوریت کی گہری تحریک کے دوران پکڑا گیا تھا، اور تقریباً سولہ سال سے بغیر کسی کیس کے جیل میں قید تھا۔ قانون کے دفتروں میں اخباروں میں کچھ خبریں آئیں کہ یہ وہی شخص تھا جسے وقت بھول گیا۔



التقديم: مصطفى ملاحت

400

زندہ رہے۔ سکینہ کو ہانڈو سے پکڑ کر اٹھایا، میں نے گھڑی اٹھائی اور وہ روتی ہوئی میرے چہرے حور علی سے اٹھ آئی۔ کچھ دیر جو کچھ کہہ دیا وہ ہاتھ دھو کر "میں بھی بال چھ دنوں ان سے پھیر دی پہچان رکھتا ہوں۔" سرکار سکینہ کی عمر میں ماں بننے والی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک چھیل میں اپنی میرے چہرے چٹختی رہی۔ بچے نے سر جو کچھ کر آٹھ گھنٹیں موند لیں۔



توازن اور نشانات کے بعد

برصغیر پاک و ہند کے ممتاز نقاد

محمد علی صدیقی

کی تحریروں کا تازہ مجموعہ

“مُضَامِينُ”

پتہ: بازار و محضر نو، ۵۹۲ اے بلاک جے، شمالی، غم آباد، کراچی

سمجھتے ہیں کہ ایک گھر گزر گیا ہے تو کتنے میں سے ہر ایک نے نہ تو جو ٹیڈا گزر گئیں ہیں۔
جب دیوار پر سے بارہ ہزار جو ٹیڈا گزر جاتی ہیں تو میری کہ گھڑی کا دروازہ کھلتا ہے اور مجھے
کہا کہ اللہ جا رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اسے ان جو ٹیڈا لے ہی گھاٹا لانے کیلئے توجہ نہ
کیا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ جو ٹیڈا ہی باہر کی دنیا کا نظام چلاتی ہیں اور میں اس کا نظام
میں ان کا واحد بھاری ہوں اور باقی انسانیت کے پچاس پچاس لے والا ہوں۔

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں یہ اسی چیز کو پہچاننے کیلئے ہوا تھا کیونکہ مجھ
 نے مجھے اپنی زندگی کا کوئی مصروف نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی آپ کو ایک کام میں گھبراہٹ
 تھا کبھی دوسرے۔ اسی طرح ایک بار میں کسی آواز کی کلام میں شامل ہو گیا تھا۔ چاہئے یہ
 آواز کیا چیز ہوتی تھی۔ سہارے وقت آواز کی۔ آواز کی کھار، پتا تھا اور پتہ اور لوگوں کے گرد
 کے ساتھ گھبرا کر ہوا تھا۔ آواز کی کے ساتھ ہم وہ لفظ اور استعمال کیا کرتے تھے۔ اب میں
 بھول رہا ہوں انہیں۔ بال۔ حقوق اور دھڑا۔ بال۔ جمہوریت۔ پتہ نہیں کیا
 مطلب ہوا کہ یہ تھا ان سب لفظوں کا لیکن اس زمانے میں مجھے خوب یاد تھا اور پتہ کے آواز والے
 میں ان کے استعمال میں میں رہتا تھا۔

پھر ایک روز ہم گھبراہٹ میں چائے پنا رہے تھے کہ چند سادہ کپڑے والے لوگوں نے اپنے ساتھ چائے کو کھانا، خرگوش، جیل میں پھنسا ہوا آٹا، پودے، پانچو، سال، چمک، کس، مصرف کیے۔ میں نے ان قسم کی فلمیں دیکھی ہیں۔

اب جو سوچنی ہوئی تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب کچھ ان بیوقوفوں نے کر لیا۔ وہ حسبِ آدائی، جسوریت و غیرہ کی باتیں، اس لئے کہ میں اپنی قوتوں اور پھر عقل میں مجھے بارہ سال رکھا گیا تاکہ میں اس "عظیم کام" کی تیار ہو جاؤں۔ (خبطِ بارہ سال مجھے احسان رہا تھا کہ میں کوئی "عظیم کام" کرنے والا ہوں اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ "عظیم کام" کیا تھا۔)

بارہ سال کی تیاری کے بعد میں اس کو فخری میں لایا گیا تاکہ باقی انسانیت کیلئے سمجھ دیا جا سکے۔
وقت کی اصل اہمیت کیا ہے اور اس کا پیمانہ کن امور اور کن چیزوں پر عین ہے۔

لہذا پھر سوچنا ہوتا تو لگتا ہے کہ بارہ سال کا عرصہ بہت مختصر ہے کیونکہ بارہ سو چھ سو سال
گزرتے ہیں تو ان سے رات ہوئی اور رات سے دن، پھر دنوں کا علم لینے سے پہلے مجھ سے بارہ
سال تیار کر لائی گئی تھیں پھر مجھے پتہ چلا کہ اس عظیم کام کے واسطے اس لئے کہ میرا
نمبر 1212 تھا اور ہاں کھڑی میں ہاتھ لگے ہوتے ہیں۔ یہ کسی لئے "اب سوچنا ہوتا تو
مجھ میں آتا ہے۔"

اس بات پر آئی کہ تیل کا قیمتیں اب اس قدر اونچے ہو گئیں کہ عام شہریوں کی معاشی کے لئے یہ ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس کی وجہ سے حکومت نے 1212 کی کوئلہ پالیسی میں بھی اسے مددگار بنانے کے لئے اس کی مدد کے تمام دعوے پر اس کو فوری صاف کر دیا۔

تھے۔ روزِ قیدی نمبر 1212 کی کڑوں سے تھوڑی سی فاصلہ تھی، تھمتے رہے کیا ہے۔
وقت گزرتا گیا ہے۔ اب بھی وقت وہاں ہے۔ اب بھی وقت پھولتا ہے۔
ابھی وہ وقت تھا۔ چنانچہ شریں نے کہا۔ یہ دیکھو کہ کیا ہے۔

مگر ہم کہہ رہے ہیں کہ "کتاب تک" سے کہیں زیادہ چیزیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے
چراغ جلتی ہیں۔ اسی لیے رو بہ زوال جاتی ہیں۔ یہ سچ نہیں کہ کہے گئے ہیں۔ تو نہیں کہ کہے
گئے۔

پھر انہوں نے تواریخ اُتار دی تھیں کیونکہ انہوں نے گمراہی میں نہ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی فراموش نہیں کیا کہ ان کے پاس تواریخ کی کتاب تھی۔ انہوں نے یہ بھی فراموش نہیں کیا کہ ان کے پاس تواریخ کی کتاب تھی۔ انہوں نے یہ بھی فراموش نہیں کیا کہ ان کے پاس تواریخ کی کتاب تھی۔

ایک تھی لڑکی

افتخار نسیم

”میں تیار ہوں ویسپ“ ایک آواز آئی۔

میں نے چونک کر پروے کی طرف دیکھا۔

وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہیں وہاں کوئی ہے میں نے جھنجھکاؤ میرے میں غور سے دیکھا۔ اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کیا حالانکہ میری عینک بائی فوکل تھی۔

”کوڑھا ہوتے جانا بھی ایک عذاب ہے۔“ میں نے بھتیجاہٹ سے سوچا۔

میں اس سال فائدہ سید ذوالفقار علی شاہ سے ملنے آیا۔ گھر وہی تھا۔ دیواروں کے اوپر اسی طرح انگوروں اور Money Plant کی پٹلیں تھیں۔ چھوٹے سے پھانگ کے ساتھ اسی طرح ”آشیانہ“ لکھا ہوا تھا۔ ہرے طوطے اسی طرح انگوروں کی پتلیوں سے لپٹے ہوئے ہرے سجھے لگ رہے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ پلاسٹر آکھڑ کر گر گیا تھا اور سفیدی نظر آرہی تھی۔ جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پھانگ سے اسی طرح آواز آئی جیسے کوئی دڑھکا تھا۔ باہر۔

”یہی کوئی بیڑ تہہ مل نہیں ہوتی۔“

میں نے سوچا۔

مگر کچھ تو تہہ مل ہوا تھا۔ مانی نے بھوک کر استقبال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے اپنا گیند پھینک کر اس کو اس کے پیچھے دوڑایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بار دوسرے سال کا لڑکا آیا۔

”انجہ صاحب ہیں۔“

”یہ تو یہاں نہیں رہتے، انگینڈ چلے گئے ہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”کب سے؟“

”تین دس سال ہو گئے ہیں۔“

”ان کے بھائی ذوالفقار ہو اگر تے تھے؟“

”جی وہ ہیں۔“

”انہیں گھر میں امریکہ سے ملے کیلے آیا ہوں۔“

”کی آپ کا ہم؟“ میں نے اسے اپنا ہم بتایا۔

لڑکے نے اونچا سا پا جامہ اور لمبے بازوؤں والی قمیض، اس کے اوپر بلیئر آئینیں والا سوٹر اور پاجامے میں چھٹی چھل پٹن رکھی تھی۔ مجھے ایک دم حسین پایا۔

”تم حسین بللا کے کیا کہتے ہو؟“

”میں ان کا پوچھتا ہوں۔“

”تمہارے والد؟“

”وہ پچھلے سال گزر گئے۔“ میں اور وہ ایک برآمدے میں سے گزر رہے تھے، چاروں طرف نوکا عالم تھا۔ جیسے ہم کسی منظرے سے گزر رہے ہوں۔ وہ سب لوگ کتاب پلے گئے؟ کیارہ بھی لکھا ہوں۔ چودہ کزن، دو نانیاں، تین بھائی ان کی بیویاں اور چھ، حسین بابا، اس کی

بیویوں اور بچے اور گاؤں سے آنے والے اس کے سارے مہمان، یہ سب کہاں چلے گئے؟

اسنے ہلے اور کھلے مکان میں مجھے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ لڑکے نے بوی آہستگی سے دروازہ کھولا، ایک دیوار پر دے کو بتایا۔ گانے کی بجلی سی آواز آرہی تھی۔ سامنے دیوار پر ذوالفقار کی تصویر ملی کی تصویر تھی۔ ایک طرف اس کے والد کی تصویر، دوسرے پریشاد چھٹی تھی۔ اس کا والد ایک کمری پر بیٹھا ہوا ہے۔ کمرے کے ساتھ کلوئرنگ رہی تھی۔ سر پر ایک ڈھرت کپڑے لگی چوڑی، اچانک اور نیچے ٹیلا اور پاجامے میں منگھٹن۔ مجھے یہ تصور 1857ء کے رہا ہے مہاراجوں کی یاد دلاتی تھی۔

”میرے لاپرواہان بہت بڑے زمیندار تھے۔“ انجہ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا تھا۔ میں دل سے دل میں مسکراتا تھا۔ ”ہاں ہمارے پوہینے سے ہلے تھے۔“ یہ ایک لطیفہ تھا اور میرے آنے والوں کی ان ترانیاں ان کمرے کی لوگوں نے گھڑایا تھا۔ ایک ماسٹر ہار کی تصویر تھی۔ کھلے گانے کی سفید قمیض چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ، چہرے میں سوچیں، چہرہ پر بھی مائل۔ اس کی شکل واقعی سکول ماسٹروں والی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اسی پٹیلے کیلے پیدا ہوا تھا۔ فرش کے اوپر درزی اور درزی کے اوپر ایک دیوار پر شین کا ریت جو جگہ سے گھس گیا تھا لیکن اس کا نتیجہ بن ابھی تک ٹھیک رہا تھا۔ لکڑی کا سینڈنگ لمپ جس میں ایک نہ قوت سا بلب کمرے کی اواسی نور پر اسراریت میں اور اضافہ کر رہا تھا۔

میں چاہا کہ ایک لمبے کیلے تمام چوہوں کو ہٹا دوں تاکہ سناہ ہو اور دھوپ اندر آجائے۔ لیکن اس کمرے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو کمرے کی روشنی کے ساتھ Ad-Just کیا۔ ایک کونے میں ٹی وی پر انجہ تھا۔ اس کے ساتھ دیوار کے ساتھ الہدی میں کچھ ویڈیو کیسٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ، دیوار پر بلیئر فریم کے بلیک اینڈ وائٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں، ہر ایک طرف ایک پرانا گراسوفون پر ابھرا تھا۔

میں نے ذرا قریب ہو کر تصویروں کو دیکھا۔ تمام تصویروں پر اسے ڈیٹروں اور ایکٹروں کی تھیں۔ مجھے اپنی اس نا اہلی کا اعتراف ہے ایک تو یہ ہے کہ گھر والوں نے کبھی فلم دیکھنے کیلئے بنائے ہی نہیں دیا اور دوسرا میرا اس سال ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے مجھ میں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کا ذرا اور شوق Develop نہ ہو۔ کچھ ٹیلیو سٹائی پرانی فلموں کے گانوں کا میں ویو نہ تھا۔ اور یہی دیا آگئی مجھے دلچسپی کے قریب لے آئی۔

میں نے ان کی افواہ کے بعد اٹھ جاتا تھا۔ ختم سردی ہو یا گرمیوں کے موسم میں صبح کی ٹینڈ اور بول میں بیٹھ اٹھ کر مجھے کی مسجد میں نماز پڑھنے جانا۔ اس کے بعد میرا کرنا اور باغ میں بیٹھ کر کتاب پڑھنا میرا معمول تھا۔ لیکن سات بے گھر چھٹا کر۔ یڈیو سٹائی سے معمول میں غماز کی طرح شامل تھا۔ دینے و سٹوڈن سے سات بے صبح سے سات بے صبح سے صبح ہندوستانی پرانی فلموں کے گانے چائے پاتے تھے۔ 1960ء کا زمانہ تھا۔ ساتھیں اور

ادب میں ایک انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ میرے دل میں اٹھی جھک دینا اور کہنے کے بعد دلی توجہ
نہیں آتی تھی۔ بات بات پر آنکھیں جاتے میں خوب دیکھ لیتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیوں
میں واضح فرق کا آٹا تقصیل علی ظم نہیں تھا جواب ہے۔

1960ء میں پوری دنیا ہی ایک روٹاری رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کا علم مجھے بعد میں
ہوا۔ پچانچہ سنگل، سنگش، کانن ریوی، گلا جھرا، جی ملک، دوڑائی کے گانے سنتا اور سوچتا یہ
لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔ ان کے چہرے کیا ہوں گے ان کو کبھی پچانیا ملا ہو گا کہ نہیں؟
لڑکوں میں ہوا ہونے کی کچھ مرادات تھیں ان میں سے ایک بریڈیو سنتا بھی تھی جس سے
میں نے پھر پور قاعدہ اٹھایا۔

پرانے گاؤں سے چار ہی میری اور اس کی دوستی کی قدر مشترک بن گئی۔ ہوا یوں کہ ایک
دن میں ہوا امجد ان کے لان میں لڑکت کھیل رہے تھے میں بلا کر قلعہ امجد نے بال کو ہٹ
کر لیا تو گیند آہ سے میں چاگر کی پور لڑھکت ہوئی ایک ڈرا سے کھلے ہوئے دروازے کے اندر
پڑی گئی۔ میں گیند کے پیچھے بھاگا اور دروازے کو تھوڑا اور کھول کر اندر گھسا تو کانے کی ہلکی سی
آواز آئی۔ "جھوٹے ہیں سب چنے سارے" یہ زہر مہائی تھی میں پچان گیا۔ میرا تجسس اور
بوجھ گیا یہ کون سا ہے؟ گھر کے میں اندر پر دے پڑے ہوئے تھے۔ روشن ان سے ملی
سی روشنی آ رہی تھی۔ دیواروں پر مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ابھی میں اپنی آنکھوں کو
اندھیرے سے ہاتھوں کر رہا تھا کہ ایک آواز آئی۔

"تم آگے نہ دو۔ کچھ ہمیں نے تمہارے لئے دیکھ رہا ہے۔"

میں ذرا گیلا بھرت پر ریت پر مجھے بہت یقین تھا۔ انہیں پلائی تھا کہ اس آواز نے پھر کہا
"لڑکے اپنی گیند دلہن لے کر نہیں چلا گئے۔"

اسنے میں گانا ختم ہو گیا اور سوئی اٹھ سی گئی۔ کئی نے گیند میری طرف چھٹی اور میں اسے
اٹھا کر بھاگ گیا۔ انہیں آکر میں نے امجد سے پوچھا۔ "اس گھر سے میں کون ہے؟"

اس کا چہرہ چلا پڑ گیا۔ "اس گھر سے میں کوئی نہیں ہے۔ اب کبھی اس گھر سے میں مت جانا اور
نہی اس کا کسی کو بتا کہ تم یہاں کیسے تھے۔"

لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جب ساری دنیا کے دیو و شیئن "جنگلی" کے "یادو" سے گونج رہے
ہیں۔ یہ کون ہے جو پرانے گانے سن رہا ہے۔ پچانچہ اب میں نے یہ "ممول" مانا کہ امجد کو
آواز دینے سے پہلے اس گھر سے کے باہر والی کڑی سے لگ کر ایک آواز کا سامن لیتا۔ لیکن
"بہت کے باروں کا حال یہ ہو چکا ہے۔" کبھی "تم رہے مستحق کتا ہڈا کہ ہے دل" کبھی گلا
تھرپا کبھی ادا ہوئی کبھی سنگل۔

ایک دن میں حسب معمول اہل گانے سننے کیلئے آیا تو حد اہت فلم کا بہ گانا کا ہوا تھا۔ جانا تھا ہم
سے دور جانے والے۔

یہ دیکھا تھا اس لئے میں وہاں سے چل پڑا۔ اٹھی ایک قدم اٹھا تو تھا کہ آواز آئی "کیوں یہ پیٹھ
نہیں لپٹ۔"

میں نے گھر آکر کڑی کی طرف دیکھا اس کی سلاخوں کے پیچھے پردہ پڑا ہوا تھا۔ "تمہارا
بہن کیا ہے لڑکے؟"

میں نے اچانک ہٹا ہوا "آپ؟" میں نے اسے دہاتے پوچھا۔

"میرا نام، جہاں ہے نہیں لڑکی نہیں کسی کو شل، انی خود، نکلا ہے تم مجھے پر پچانیں
کر۔"

تو 1970ء کی طرف تھی مجھے اسے کاسم کی رو سے بات کر رہا ہوں۔ "سنو تم روز میں
کانے سننے کیلئے آتے ہو میں تمہیں دھاتی ہوں۔ تمہیں پرانے گانے اچھے لگتے ہیں اگر تم اس
گانے دن کا ہمارا توہاں کی دوستی ہیں۔"

اس نے گانا گایا۔ اس آواز کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔
"کانن ریوی۔"

پردے کے پیچھے خاموشی تھی۔

"فلاٹ ہے کیا؟" میں نے گھر آکر پوچھا۔

"نہیں میں جہاں ہوں تم نے کیسے جانا؟"

"مٹی میں روز سیلون سنتا ہوں۔"

میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اب میرا یہ معمول بن گیا اور جیسے امجد نے بھی اس بات کو قبول
کر لیا اس لئے وہ میری ریوی کا رات رات قلعہ آواز گھنٹہ گانے سنتا "اس" سے باتیں کر رہا
کبھی وہ کمزری سلاخوں کے پیچھے مجھے مشائی دے دیتی کبھی ملو، کبھی کھیر، کبھی چائے۔

اب گانوں کے ساتھ ساتھ پرانی فلموں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا چلا
گیا۔ اب میں امجد سے ملنے کم لور "اس" سے ملنے زیادہ جاتا تھا۔ مجھے جہاں اس بات کی تھی
کہ اس کے گھر والے مجھے اس بات سے منع کیوں نہیں کرتے۔

سیدوں کا گھر اپنی عورتوں کی پردہ نشینی کیلئے کافی مشہور تھا۔ اڈل تو وہ کبھی فلم دیکھنے جاتی ہی
تھیں، کبھی موقع ہوتا تو شہر کے واحد "منڈا دے" پر کانٹے پردے لگا دیے جاتے اور ایک
شو پر دے کا پرانا۔ سید اقتدار علی شاہ کے گھر والے کیلئے وقف کر دیا جاتا۔ امجد کا دوست
ہونے کے باطن سے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا لیکن وہ مجھے کبھی نظر نہیں آتی۔

لو گھر کچھ دنوں سے لپاکی تہ بلی کی باتیں دور ہی تھیں۔ گھر کا سامان بانو حجاز ہا تھا۔ سکول
سے ہم سب بکن بھائیوں کی رپورٹیں اور سرٹیفکیٹ لئے جاتے تھے۔ گھر میں ایک
لور ہم چلا ہوا تھا۔

میں چھ سات دن "اس" سے ملنے جا سکا۔

ابھی میں کمزری کے پاس پہنچا تھا کہ اس کی آواز آئی۔ "آگے دو میرے مرنے سے پہلے آگے
ہو۔ ابھی کیا میں نے تمہاری کتنی اور کتنی۔" شو مو اتم نے دیا نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر تم نے اس
کی آنکھوں کو نہیں دیکھا۔

مخمل میں جل اٹھی شمع پرانے کیلئے

پریت یعنی ہے دنیا میں مری جانے کیلئے

"پہلے مجھے کا بچھو پتہ نہیں۔ دوسرا حصہ دینا کا ہے اور گانا لڑا کا" میں نے حسب عادت
جواب دیا۔

"تم اتنی دیر گمالا ہے؟ میری دنیا کچھ دن روئے۔"

"ہم چاہتے ہیں لپا کر اپنی لپا کر نہ گیا ہے۔"

ایک لمبی خاموشی پچان گئی باہر والی گھر سے ہوتے جاتے تھے۔

"تم اندر آ جاؤ۔" میں برآمدے سے ہوتا ہوا اس کے کمرے کے دروازے کو کھول کر اندر
چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی روشنی تھی۔

گھر گھر کے چھائی بدیا ہا ہوا نہ جا

روئے ہیں نہیں ہانورے ان کو سمجھا جا

"جانتے ہو یہ کس فلم کا گانا ہے؟"

"نہیں؟"

"ایک تھی لڑکی کا"

"آج میں تمہارے سامنے آ رہی ہوں۔ اب تو تم چلے جاؤ گے، مجھے چھوڑ جاؤ گے۔ سب مجھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماسٹر لڑ بھی مجھے چھوڑ کر پردیس سدھارے۔ میں نے لپٹا من اور تن لپٹا کر دیا تھا لیکن وہ مہنگو امیر لڑن۔ کار سات سندھ پار چلا گیا۔"

ہم چاند کو ان کے دھوکے میں گھبرا کے اشارہ کرتے ہیں
بھٹوئن تمہاری دنیا میں رو رو کے گزرا کرتے ہیں

شیڈنگ لپ کی روشنی میں ایک بال بال باہر آیا، اس نے بازرب پٹی ہوئی تھی۔ اس کے لوہے سیاہ لونگا تھا جس پر گونے سے کام کیا ہوا تھا۔ پھر ہاتھ آئے ان پر مندی لگی ہوئی تھی لوار بازوؤں میں بکڑے۔ پھر سرخ رنگ کی چوٹی لور پونی کے لوہے زرد دھندلے جیسے ہندوستانی فلموں کی ہیروئنوں نے پس رکھا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک دم میرے سامنے آگئی۔ میں چونک گیا۔
"یہ کیا ہے؟" میں سوچ رہا تھا۔

"مجھے علم ہے تم کیا سوچ رہے ہو میں کیا ہوں؟ عورت ہوں یا مرد؟ یا کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں بتاتی ہوں میں کیا ہوں؟ میں وہ لائق ہوں جو قدرت نے عزت دار لوہے خٹلے والے تیدوں کے ساتھ کیا ہے۔ میری جنس مکمل ہونے سے پہلے ہی اس دنیا میں کھج دیا۔ میں ایک عورت ہوں جو مرد کے جسم کے اندر قید ہے۔ میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے کبھی نہیں ملو گے لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر کہیں خدا ہے تو اس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں ایک بزرخ میں ہوں، اگر تم کبھی واپس آؤ گے تو مجھے یہیں لٹکا ہوا پاؤ گے۔ میں نے ایک ہی شخص سے پیار کیا تھا، ماسٹر لوار سے اور اسے بھی میرے بابل نے وٹس نکال دیا۔ اب تم چلے جاؤ ہے، وہ کبھی وقت ملے تو مجھے ملے کیلئے ضرور آؤ۔"
"ہاں میں ضرور آؤں گا۔ لیکن آپ کا ہم" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"عام سے کیا ہو تا ہے۔ تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو" اس نے تمہیری آواز سے کہا جس میں درد بھی تھا اور تمہیری تان بھی۔

"جی ہم کل کراچی جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔
"اوہر آؤ؟"

میں اس کے پاس گیا۔ ایک خوشبو نے مجھے احاطے میں لے لیا۔ اس نے میرے ماتھے کو چومنا۔ "اب تم نہیں لگی ہو تم میرے ہو۔"
میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ لور اب اتنی دیر کے بعد اس سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔
"تم کتنے بدل گئے ہو؟" اندھیرے میں سے آواز آئی۔

"ہاں"

"کتنے ہیں تمہارے؟"

"تین ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔"

"مبارک ہو؟"

"کبھی مجھے بھی یاد کیا؟"

"کوئی دن ایسا نہیں ہو گا کہ میں نے یاد کیا ہو۔"

میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارے جذباتی تو نہیں تھے۔"

"وہ تیار ہو کھلی ہے۔"

"ڈاکٹر تم نے اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھا۔ بتو یہ کس فلم کا انشیاگ ہے؟"

"مجھے کچھ علم نہیں میں یہاں پہیلیاں کھٹے نہیں آیا۔ میں صرف یہ کہتا آیا ہوں تم نے تمام عمر اپنے ماضی کے عمو قوں کے ساتھ گزار دی ہے۔ تم جیسے بڑا لڑکا بچہ کروڑوں لوگ اس دنیا میں زندہ ہیں اور تم نے ایک کمرے میں اپنے آپ کو مقید کر رکھا ہے۔ باہر آؤ کبھی آن کی دیا لگی دیکھو۔" میں نے جھنجھکا کر کہا۔

"مجھے علم ہے۔" ایک دیر خاموشی نے مجھ سے کہا۔

"مجھے یہی نظر تھا ایک دن تم مجھ پر اپنا حق بنائے کیلئے آ جاؤ گے۔ اب تم چلے جاؤ، تم دو نہیں رہے۔ تمہارا قصور تم سے زیادہ ظہور سے ہے۔ میں نے اپنے بچپن سال ماسٹر لوار کی یاد کی طرح تم پر بھرا کر دیے۔"

مجھے ایک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں اس کے ساتھ کیوں بھگڑا ہوں؟ میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

"مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ تم نے تمام عمر پر بھائیوں کے ساتھ گزار دی۔ میں امریکہ سے آ رہا ہوں۔ ہاں انقلاب انقلاب آیا ہے کہ دو عالم جنس اپنی رضامندی سے اپنی ترنگی جنس کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور ایک تم ہو کہ وقت کے قدموں کے نیچے ایک دری کی طرح مجھ گئے جسے دور نہ تا ہو اچلا گیا۔ مجھے بتاؤ وہ سب لوگ کہاں ہیں؟"

"نصیر! مجھے دیکھو۔" وہ ایک دم نہیں لپ کی روشنی میں آگئی۔ وہ تو ویسے کے ویسے تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی سلوت یا بھری نہیں تھی۔

"میں نے بھی وقت سے انتقام لیا ہے۔ اسے عقید کر کے اس کی حد سے بہت آگے نکل گئی ہوں۔"

مجھے اپنے ہونٹوں سے ہونے کا شدید احساس ہوا۔

"جیسے تم لوگ اپنے آپ کو اپنے بچپن میں تبدیل کر دیتے ہو، تمہارے بچے تمہاری عمر کا اشارہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح تم کبھی نہیں مرتے، امر ہو جاتے ہو۔ اسی طرح میں بھی امر ہو گئی ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو تمام دنیا میں ڈھال دیا۔ میں زمان و مکان جنس، جنس سے لوہے اٹھ گئی ہوں، یہ جو تم میرا ماضی کے ساتھ ایک ٹوٹ رشتہ دیکھ رہے ہو میں جو ہر وقت پرانی فلمیں دیکھتی لور پر اسے گائے سنتی ہوں۔ اس میں مجھے اپنا مستقبل، آنے والا کل نظر آتا ہے۔ جیسے ایک دائرے میں کھڑے ہو کر آدمی اس دائرے کے ہر نقطے کو دیکھ سکتا ہے۔ ویسے میں بھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ سکتی ہوں۔ تم نے اسے سال اپنا "باہر" فتح کرنے میں لگائے ہیں۔ وہی سال میں نے اپنا "اندھ" تسخیر کرنے میں لگا دیا۔ جسے تم پر چھائیال کہہ رہے ہو ممکن ہے وہی اصل جسم ہوں۔ ممکن ہے یہی آوازیں اصل ہوں اور باقی ہم سب ان کی بازگشت۔"

میں بھولی گیا میں کہاں ہوں اور کس سے بات کر رہا ہوں۔ ایک روشنی مجھے اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔ میرے اندھ بیٹے چور کو لے کھڑے تھے جن میں بیٹے اندھ میرا رہتا تھا روشن ہوتے چلے گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو مکمل تبدیل ہوتے دیکھا۔ میں ایک چھوٹا سا لارولن گیا، اسی رتم کے اندھ میں ایک بچے میں تبدیل ہو گیا پھر میرے دو کھڑے ہو گئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی بن گئے۔ پھر وہی لڑکا اور لڑکی، مرد اور عورت میں تبدیل ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ ہم دونوں میں سے ایک تیسرا شخص نکلا جس نے کہا

"میں مکمل انسان ہوں۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ اٹھا۔

"شاید میں لوگہ گیا تھا۔" میں نے معذرت کی۔

"انکا ستر جو کر کے آئے ہو۔"

روائی مومن

بچے شاہد و بادہ، صبر، توبہ توبہ
اس عمر میں دل پہ جبر، توبہ توبہ
ایام شباب اور دل جو، ساقی
فصل گل و جوش ابر، توبہ توبہ

"Revolutions have never lightened the
burden of tyranny: They have only
shifted to another shoulder."
(Bernard Shaw : 1903)

میز پر چائے اور اسیٹ چڑے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔
کھانا کھا کر مکمل لکڑا میں خام غذا ہے۔ تعلیمات پر، ان کا مکمل ہونے پر۔
"تمہیں یاد ہے جب تم چار بے تھے تو میں کون سا گانا سن رہی تھی۔"
"نہیں۔۔۔" تو میں ایک بار پھر تمہیں ماضی کے تھکوت میں لے جاتا کہ تم ایک بار
پھر وہیں ملے چائے کے اپنی دنیا میں۔ مجھے ہم سے اب تم بھی اوت کر نہیں سکتے۔"
اس نے دیکھو لوں کے اہل سے ایک دیکھو لوں۔

گھر گھر کے آئے بدردار سہارا نے جا
روئے ہیں نہیں، باورے ان کو سمجھا جا

ہر آدمی کو سننے کا۔ یہ کس قسم کا گانا ہے "وقت گزرا گیا" میں کہاں ہوں اور سب لوگ
کہاں ہیں؟ میرا نام کتنے گنا۔
"اب تم چلا" اس نے گانا میں اٹھ کر گزرا ہوں ان کے تاج کو میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ
رکھ دینے میں نے کوئی عزت امت نہ کی بلکہ اس سے گواہی سہارا تھا وہ ابھر نکل آیا جیسے
کوئی درگاہ سے تھک لے کر آیا۔



گر قبولِ افتد.....

پاکستان کے "پانچویں صوبے"

"نیویارک"

سے پہلی مرتبہ ایک مکمل، سنجیدہ اور متنوع ادبی

جریدے کی اشاعت کیلئے احبابِ ادارہ ماہنامہ "زاویہ"

کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں

شاہد چغتائی

نظمیں

ستیہ پال آنند

ایک پینٹنگ کو دیکھ کر

دور نہیں مقرر میں ایک دریا، چمیل، خشک میدان
 نسل کش، نگار کی، بڑ زلزل، لاو اور صرتی
 نرود مقرر میں خشک سر دودھ ہے
 جو جسم کی اپنی مودوی ہے ریو نیو میٹری میں
 صرف ایک شا رنگ ساسات
 نظر آتا ہے، جیسے
 دیکھنے والوں سے
 یہ کہنے کی کوشش
 کر رہا ہو
 میں تو
 اور انش
 کی ایک
 ایک
 عادت
 تھا، جسے
 دیکھ
 کیا
 تھا
 کہ
 میں
 میں
 کیا
 میں
 میری
 دنیا
 مر
 مگی
 ہے

سراٹے سراٹے ہے

جدھر دیکھتا ہوں
 چکا چوند شہروں کی
 جگمگ مکاں، روشنی کے جزیرے
 لوازم بھی عیش و عشرت کے
 آسائشیں زندگی کی
 کھلی شاہراؤں پہ کاروں کے دریا
 بچہ اگھر، شرابی
 فلیٹے، شرارے
 بھی رقص گاہوں میں اڑتے ہوئے
 نیم ہوش جوڑے
 بھی کچھ ہے، لیکن
 اگر چشم پینا سے دیکھیں، تو سب کچھ
 یہاں کھوکھلا ہے
 میں اندر کے اپنے
 تنہے بارے میں اسے یہ کہتا ہوں، بھائی!
 یہاں ٹوک کے آخر تمہیں کیا ملے گا؟
 یہ پردیس کا اجنبی شہر ہے
 اس میں کب تک رہو گے؟
 سراٹے سراٹے ہے، گھر تو نہیں ہے!

جسم کے دو روپ

ستیہ پال آنند

(پہلا روپ)

جسم خود کو بانٹتا ہے
اپنی حدت، اپنی خنکی
لمس کی نرمی، تنفس کی حلاوت
بانٹنے کی نعمتیں ہیں

جسم اپنے چاہنے والوں میں یہ سب
نعمتیں تقسیم کرنا جانتا ہے
مختلف دلقوں میں اپنے ہاتھ کو کچھ روک کر
یہ جسم اپنی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے
پھر سے بانٹنے کو

لینے والے سب براہ
ایک جیسے

ہاتھ پھیلائے
بدن کے رزق کی خیرات لینا چاہتے ہیں
جسم کی صحت بھی اس پر منحصر ہے
خود کو رزق خیر کی مانند بانٹے

(دوسرا روپ)

جسم خود میں مجتمع ہو کر ہی جینا چاہتا ہے
لعمتیں ساری ہیں اس کے پاس، لیکن
بانٹنے کو کچھ نہیں ہے

اک خزانے کی طرح
زہم زمیں رہنا ہی اس کی زندگی ہے
دھوپ کی جاں بخش حدت
یا ہوا کی نرم خنکی

اس کی قسمت میں نہیں ہے
جسم ہر پل تھوڑا تھوڑا
ڈرہ ڈرہ لوٹتا ہے

آخر ش یہ ڈھیلا ڈھالا
بھر بھر، مٹی کا تو دو، جسم
اپنی موت مریاتا ہے
اپنے وقت کے آنے سے پہلے

میرے خدا!

میرے خدا!

میرے ان جذبات کو

ان کی دھڑکن سے چانا

جن کی تھکن تو نے

خود اپنے سوسوں کے رنگوں سے کی ہے

تو جانتا ہے کہ رنگوں کو کبھی بھی

دھوپ لالے جاتی ہے

میرے خدا!

میرے جذباتوں کے رنگوں نے تو

تیری قدر سے ذخیرہ کی پائی تھی

ان پر ان کی دھوپ کا سایہ نہ پڑے دیر

میں تو اس خود کو

منہ کے آخری دور

اور صبر کی انتہا تک پہنچنا چاہتی ہوں

تناسب

کسی بھی سوسائٹی میں

میرے جیسے لوگ

دس سے کم پر سنٹ ہوتے ہیں

باقی نوے سے اتنی پر سنٹ

تمہارے جیسے

اگر اشی فیصد لوگ

آبادی کا تناسب

یہ قرار نہیں رکھ سکتے تو

"فیر بنے من"

ایک مختلف سرا

خلق میرے اندر تمہارے درمیان

ایک بارگاہ ہے

وہ باریوں کے ساتھ

سائے رات کو اگر حق تو جیت ادا کر سکو

تو میرے بارے میں سوچ لیرا

میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں

اب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا

پھر لوں گی چوں کہ میری تھکن والی لڑکیاں

بپ بچہ کے کمرے میں سے رات بھر جاتی ہیں

تو ان کا مالک

ان کی کمرے

اس اللہ کی آغوش میں ہوں

میں مظلوم اور مستحق نظر آتی ہوں

خندہ سے

شیلا

ترجمہ: شمشیر الہیہ

بھائی کی نگری

نہیں خشک دھرتی سے تھوہر تراں
چلتی ہے جلی کہیں آں پاس

انھا ساز اپنے جیالے چنے
نئے سر نئے گیت گانے چلے

وہ مل بیٹھ کر گاؤں کی عورتیں
پچھے کپڑے؟ خوش ہو کے سیتی رہیں

سدا ماما مسکراتی رہے
سدا آگ چولہوں میں جلتی رہے

دیئے پیار کے جگمگاتے رہیں
کمل روپ چہرے انہ مرجھا سکیں

بھائی کی نگری سدا خوش رہے
ہر اک دیس پردیس پھولے پھلے

مرے خندہ والے ازل سے آیا
کسی کی برائی سے ہیں بے نیاز

وہ مجھے سے مل کے بھی مجھ سے جدا ہے
کسی آنکھوں میں رستہ کھو گیا ہے

جو راتوں میں شعاع نور دیکھے
وہ میری آنکھ میں اس کا دیا ہے

مٹانا خندہ کو بھی دشوار ٹھہرا
کہ شہر دل کا وہ فرماں روا ہے

صبا خاموش، پھولوں کی زباں چپ
وہ مجھ کو بھول جانا چاہتا ہے

کرن بن کر سوہیوں میں ڈھلی ہوں
محبت کتنی قربت آشنا ہے

میں آنسو روک کر تارے اٹھا دوں
بچے جانا مسلسل تابوت ہے

ستارے ٹوٹے رجتے ہیں شب بھر
کہ فطرت بھی تو میری بے ملوا ہے

جب اتمام ٹوٹی ہے زمین پر
سمندر راستوں کو کھینچ گیا ہے

خیال کی بستی

شمشیر الحیدری

حقیقتوں کو طبیعت کی روشنی پہنچی
نظر کے سامنے میری محب نظر تھا
ہست ہی دور کسی قہمی خیال کی بستی
قریب ، دور لگا میرا ہی تصور تھا

محب حرم کی خوابوں کا تھا ماحول
نہا مسج تھا میدانِ رات کا ماحول
لفظ میں خوف کے آثار تھے بھی پیدا
جہاں کے سارے المیے وہیں پہ تھے باہم

ہوا کا سینہ پہنا ہوا تھا بچوں سے
قلب کو لرزہ تھا وہ بچوں کو وحشت تھی
ہر آنے والے سے حسد کے لڑنے لگے
قند کے خوف سے دھرتی بھی رہی بے پشت تھی

بھی ہے انہیں کے آئندہ آنے والے بھلا
کریں گے آگے بھی اپنے وقت کی منزل
کوئی تو ان کیلئے روشنی بجائے گا
کریں گے گرم ہو گا عزم کی محفل

بھٹوں کے وہ سر ایسے پہلوں ہوں گے
کریں گے دن کو سحر تو رات کو رنہم
قلب کا اونچ قدم ان نے جھک کے چمکے گا
زائے نور کے مشعل ہلائیں گے عہم

ایسے کی لو تو کسی حال میں رہے قائم
یہی ہے میرے عقائد کا فیصلہ لہذا
پہا جیسے لڑائے ہیں میرے بیٹے میں
ہوا کے دور سے لڑا کہ ہے حوصلہ میرا

حقیقتوں کو طبیعت کی روشنی پہنچی
نشانِ رات ہے دانے وقت کی بستی
ہے نورِ فکر سے روشنی خیال کی بستی
صبرِ غار سے ہے جہدِ لڑائی میں حرکت

محبوبوں کی اسی رات پہ نظر رکھتے
خیال ہے یہ دینے کو کہ وہ رہے قائم
گرسے تو انکو ہلا آگے اس قدر بیل
رہا کے غور کو دینے کو رکھے صحیح سالم

محبوبوں کی اسی رات پہ نظر رکھتے
یقین کا تو یہی وہم ہی گزرتا ہے
مگر خیال کی بستی میں کیا نہ تھا عشق
ہوا کے دوش پہ چھٹنے کی زندگی کیا ہے

یہاں تو نورِ نچرے ہے کوئی آنکھوں کا
نظر لے جاتا ہے دم دم ایسے میں تب حیات
دھاتے جاتا ہے پل پل ذرا ذرا مٹ کر
ہاں کے رکھے ہیں عالمِ جہا اپنے دھ

ایسے کی لو تو اگر چھ مچی تو کیا نہ گا
ابھی تو کتنے محبت کے مریٹے ہوں گے
پھر آج رات کی موتی کا حال کیا ہو گا
صبح کے راتوں کے کس طور سلتے ہوں گے

"Wrong Exit"

ریحانہ قمر

مگر یہ زندگی کے ہائی وے پر چلنے والے کب سمجھتے ہیں
غلط ایگزٹ پر مڑ جائیں تو منزل چھوٹ جاتی ہے
مجھے دیکھو

مجھے بھی ایک ایگزٹ پہلے مڑ جانا پڑا تھا
اور میں بے انت رستوں پر نکل آئی
نہ جن سے لوٹنا ممکن

نہ منزل تک پہنچ پانا مرے بس میں
میں بڑھتی اور چھڑتی، دور ہوتی چور ہوتی جا رہی ہوں
دشٹِ ناہر سال کی وسعت میں

نہ بستی کا نہ بیڑوں کا نشان جس میں
پرندے ہیں نہ سایہ ہے نہ پانی ہے
نہ واپس لوٹ جانے کا کوئی ایگزٹ

اگر کچھ ہے تو وہ میرے سفر کی رائیگانی ہے
مری فریاد کی دم توڑتی آواز نے میری سماعت چھین رکھی ہے
ضمیں ہے "نوسو گیارہ" کی سمولت بھی!
اگر ہوتی

تو بے آواز لفظوں کا دوا کوئی کیا کرتا
کوئی سنتا تو کیا سنتا؟

مرے بالوں میں اتری (رایگاں میرے سفر کی) دھوپ کوئی کس طرح
چٹا؟

مری آنکھوں کے پتے رات کے آثار کوئی دیکھتا کیسے؟
کوئی کیسے سمجھتا

زندگی کے ہائی وے پر اک غلط ایگزٹ پر مڑ جانا قیامت ہے
کہ میں تو یہ بھی کہہ سکتے سے قاصر ہوں
"مجھے دیکھو!"

ایک نوحہ

احمد سلیم

یہی عادت ہے اس کی

منصورہ احمد

ترے دیدار کا موسم ہے
اور آنکھوں میں دل کا رنگ نرانا ہے
ترے جلوں کی رات صبح ہے
اور گلیوں میں آفتاب کا سا سما ہے
تری انجم نظر چھ پر بجلی
اور موٹی چہرہ دوسے اور آنکھوں سے
مرے دل کے خزانے میں
کیسی سڑکوں پہ چرواہوں میں الجھتے کوئی تو بھڑا بھڑا
کیسی غٹا ہوا چہرہ نظر کو بانہ لیتا ہے
کسی تھکنے پر ہی دل میں آئے ہیں
یہ سلامت چمن باغ کے گل کے نکلنے کی
مگر اس سلامت دیدار میں بدم
دل پر غول کی لانی اب ترے رنگ سے جھٹکتی ہے
ترے ہاتھوں میں میری آنکھوں کی ٹپکی بولنا مارنے لگتی ہے
کا پیسے بڑے مرتے ہیں
ترے دیدار کا موسم ہے
اور گلیوں میں اندازوں کے مراد ہاتھ اٹکتے ہیں
ان کی بے پروا آنکھیں
راست دیدار سے محروم اجائے کس کا تختی ہیں
یہ شہر صلی کی سلامت ہے بدم
نور میں دل کے غلوں تک بھر دیا ہوں خون کا پال
مری آنکھوں میں تیرے لب لٹکے اور چھ گنگے ہیں
مرے ہر لٹوں پہ حیرت انگیز ہے سو تاجیں اور تاج
بھر گئیں سو گنگے کناروں سے
ترے دیدار کی رات اب نہ رنے کی ہنس نکلتا
یہ سنس قریش گل پڑا اور کتنا خون چھڑکے گی؟

یہی عادت ہے اس کی
اک جھلک اسے کر کہیں رو پویش ہو جانا
کسی کو بندے کی مانند
آنکھ کی چو کھٹ کو چھوٹا
اور چھپ جانا
کسی بے مہر جھوٹے کی طرح ہل میں گزر جانا
اسے کیسے کے کوئی
کہ صحرانوں کی جلتی پیاس بزم مجھ سے نہیں پہنچتی
اسے کیسے کے کوئی
ہوا کے ایک جھوٹے سے
ہزاروں سال کی کرہلی کٹھا
کیسے کے کوئی؟

ایلن گینسبرگ کے نام

حسنِ تجلی

ایونٹو فٹتھ پر رہا کر شنا کے جلو سوں میں

کھڑا تھا ایک بوڑھا

بمشکل ایلن کا

کیروی رنگوں

جلترنگوں اور دھالوں

گورے کالے سات رنگوں کے جلو میں

جون کی دوپہر میں چپ چاپ اور تھا

الگ سب سے

اس طرح جیسے

وہ سارے فلسفوں کا بن گیا ہو آخری نکتہ

ایونٹو فٹتھ پر چلتے جھوموں میں

میں اک کھویا ہوا ہے

میں اس کے خیال کی انگلی پکڑ کر دور جا نکلا

کہیں سیہون کی گلیوں میں

”سربازاری رقصم“

یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہوا پہلے سا لگتا ہے

”مردانا“ کی سرگوشی

میرے کانوں کو ”مردانا“ سی لگتی ہے

ایونٹو فٹتھ بھی میرا

سیہون کے گلی کوچے بھی میرے

پو تر سندھ کے روشن کناروں پر

لٹکے رنگ وید کے سب شہد بھی میرے

ہری رہا کر شنا کی صدا کہیں بھی مری

اور سب آیات قرآنی بھی میری ہیں

کہ میں پانچی کا باغی ہوں

پو کھراں کا پہلا منکر ہوں

کہ میں منکر ہوں اور نگریب کی ساری خدائی کا

وطن تیری خدائی کا میں جب بھی گیت گاتا ہوں

میں خود میں لوٹ آتا ہوں

مگر گولی کی لالی میں وہ مجھ سے بات کرتے ہیں

وہ دیواروں پر تحریریں نہیں پڑھتے

کہ جرنیلوں کی وردی پر گدھا پیشاب کرتا ہے

نئی دہلی کی خون آلود گلیوں میں

رقص کرتا ہے کوئی سرمد

”خدا یم من، اہلی چند ختم غیر“

اہلی چند تیری آنکھوں پر

قطبِ اقطاب، دیووں کے وضو ٹوٹیں

مرے اندر کی عورت

اور یہ انگور کی میٹیں

وہی ہے چاند بدسن پر

رو پہلی شام جیسے سندھ پر اترے

وہی جیسے خمیر ہے!

Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs.

MONEY TRANSFER

MENHARAY

TRADING

Sent Money to Pakistan with Best Rate & Quality Service.
Delivery in any city of Pakistan



- ★ Lahore
- ★ Karachi
- ★ Gujranwala
- ★ Sialkot
- ★ Gujrat
- ★ Faisalabad
- ★ Kharian
- ★ Tobatek Singh
- ★ Chicha Watni
- ★ & Peshawar

FOR BEST RATE, CALL RIGHT AWAY
TEL: 718-507-6000 FAX: 718-779-4381

75-18A JACKSON HEIGHTS, BROOKLYN NY 11373

Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs. Rs.

تعارفات

منیر نیازی ایک بر خود غلط

جوہر منیر

منیر نیازی کے بارے میں ڈاکٹر یونس مٹ جو کچھ تحریر فرما چکے ہیں ان میں اداکار تو نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر منیر نیازی کو لڑائی اور شعری صدی کا مہمور بر خود غلط قرار دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ اس لئے نہ ہو گا کہ بر خود غلط ہونا کوئی بڑی بات ہو تا تو منیر نیازی ہر دو چار ماہ بعد اس کا ثبوت پیش کرتے سے اخترا کر تا ہے اس پر صحت ہی قابل احترام معاصرین کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے آپ کو چیلانے سے باز آ جاتا اور ساری توجہ دوسروں کی عیب جوئی کے جائے لپٹا ہوا جھنجھنے پر صرف کر دیتا جس کے بہت ہی ذہک خوردہ ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں، منیر نیازی کی مثال میر اسطیٰ کی اس مہمورہ جھنجھی ہے جو بے تو جی کے دلوں میں اپنے کو لٹے کے سامنے کلی میں برکت سا پھڑکا کر دالیا کرتی تھی، سب بھی ایسی کا پاؤں چھسکتا اور مہمور سے گر جا اور قہقہے لگاتی، گرنے والا جو لٹا ہوا توئی اور غلام گالیوں کی دھچکا کر دیتا، وہ گالیوں میں کر بائی ہانپ ہوا جاتی، ہم گالی دہشت اور تسکین کے جھٹکوں کی طرح اس کے بدن کو جھنجھوڑتی تھی اور پھر اس کے پیچھے کے علاوہ کئی اور مقامات پر لٹھ پٹی ہی پڑ جاتی، منیر نیازی کے تو ہیں تیسریا ت کے چھڑکاؤ کوئی اور مطلب نہیں ہو سکتا۔

حیرت اس بات کی ہے کہ منیر نیازی کے بیانات سے اتنی بات نہ لے والے ہو رگ جو لپا کچھ کہتے کیوں نہیں؟ ان کی خاموشی کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ منیر نیازی کو اس تسکین کا مستحق نہیں سمجھتے جو میر امنی کی عمر سیدہ ہالی کی حاصل کرتی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ ان کے کچھ کہنے سے منیر نیازی نے اپنا "چھڑکاؤ" بند نہیں کر دیا، اس نے ہر پار چھڑکاؤ کرنا ہے اور لپا کچھ سننے کیلئے، منیر نیازی کے بارے میں کچھ نہ کہنے والوں کے رویے سے ایسا شخص ہو جاتا ہے کہ جو شخص ایک لفظ باریادہ اور اتنا ہے اس کا منیر نیازی پر، خود غلام جانا تحریر لکھنا ہوتا ہے۔

منیر نیازی کے بر خود غلط ہونے کی تشخیص کرنے والوں کا ایک حوالہ موصوف کا لکھی ہوئی چاہے اصل ناقدی کا بیان ہے، قلم ہے، قلم شریٹن نے مگر صد لڑائی شلٹاشی کے سرٹیفکیٹ کی، لکھنے کے بعد لکھی اس کی طرف سے معاصرین کے خلاف ہر دوسرا لپا کا شکر نہ کیا پتا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اور حقیقت مہمور خود غلط ہے، صد لڑائی شلٹاشی کا سرٹیفکیٹ ان کی دشمنی، ان کی سر ہم پٹی نہیں کر سکا پھر یہ کہ منیر نیازی نے شلٹاشی کے سرٹیفکیٹ کو اپنی ہر دوسرا لپا کی شلٹاشی سمجھ لیا ہے۔

اپنے ہاتھ پر انگریز میں غالباً جزل پور شرف کی "شلٹاشی" حاصل کرنے کیلئے اس نے جس چھڑکاؤ کا دام بٹھایا ہے معاصرین کی توجہ کا مستحق ہے، خاص طور پر ان کی توجہ کا جو بہت ہی سینئر شاعر اور لڑائی کے خلاف منیر نیازی کے جڑوا دوسرا لپا، پیارا کسی کی وجہ سے اپنے اہم اور مرتبہ اپنی شعری اور لڑائی شریٹن کے بیچوں کے حوالے سے کہیں لکھنے نظر نہیں آتا۔ منیر نیازی اگر جناب محمد نیک کا کی جیسے اور دیکھ، تعلیم اور شاعر

ساز شاعر کو شاعر تسلیم نہیں کرتا تو کسی اور کے شاعر مانے جانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ اگر نہ ہم صاحب کو افسانہ نگار نہیں مانتا تو کسی اور کے افسانہ نگار کہے جانے کا کیا جو انہی باقی رہ جاتا ہے؟

شعری دنیا کے اس "کتاب" نے بے نظیر اور نواز شریف کو نام نہاد جمہوریت کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔ نواز شریف کی نام نہاد جمہوریت کے اس احسان کا خیال بھی نہیں کیا جو صدر لٹ شلٹاشی کے سرٹیفکیٹ کی صورت میں اس پر کیا گیا ہے۔ منیر نیازی نے یہ جو کہا ہے کہ "ہم سب بے ایمان لوگ ہیں" اس کی احسان فراموشی کی منطق سے درست ہی ہے یعنی منیر نیازی شعری اور لڑائی معاملات ہی میں بے ایمان نہیں سیاسی معاملات میں بھی ایمان نہ لری اسے چھو کر نہیں گزری، وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوتا تو پاکستان میں "ہم سب بے ایمان ہیں" کے پس منظر سے آگاہ ہوتا، اسے معلوم ہوتا کہ جرنیلوں کی زبانوں سے مشرف ہونے والے معاشرے کسی کو ایمان نہ رہنے ہی نہیں دیتے۔ اسے پتہ ہوتا کہ پاکستان میں جمہوریت کو "ہم نہاد جمہوریت" بنا دینے کا سرہ کش کے ہر ہر حاویا ہے۔ پاکستان کو کرپٹ کر دینے بلکہ کرپٹ کر دینے کی روایت جس نے ڈالی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اصطلاحاً کوئی کامل، اکمل چیز نہیں ہوتی۔ یہ دنیا میں کہیں بھی کامل و اکمل شکل میں رائج نہیں۔ یہ تو ایک پوچھا پتا ہے جو مسلسل مشق سے جدا جدا سے، انسانی حقوق کی ہر رنج آسودگی کے ساتھ چلتا پھرتا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں تو اس کا مستقبل کبھی محفوظ نہیں رہا۔ غصوں کے شب خونوں نے کبھی جمہوری عمل کو برداشت ہی کب کیا ہے؟ پاکستان میں تو الملوں تللوں سے جو کچھ رائج رہا ہے وہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکا۔ منیر نیازی کے یہ الفاظ اس کی ذہنی بلک کر بھن کا کا قابل توجہ ثبوت ہیں جو اس نے جزل پور شرف کے "کچھ کر جانے" کی توقع میں کے ہیں، وہ پڑھا لکھا آدمی ہو تا۔ اسے سیاست کا لڑائی سا شعور بھی ہوتا تو طاقت سے "مسلط کی ہوئی جمہوریت اور ایمان لڑائی" کی وکالت نہ کرتا، وہ اصرار کرتا کہ معاشرے کے سیاسی اور فکری اور نظام میں بدخلیت کی جائے۔ معاشرے کو اپنے تشادات کے نقطہ عروج کی طرف دھکیل دیا جائے تاکہ وہ اپنے نظیر سے تبدیلیوں کی خبر لائے۔ منیر نیازی جیسے بر خود غلط افراد کی دانست میں جزل شرف نے نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ کر نام نہاد جمہوریت کا خاتمہ کیا لیکن ایک سیاسی طالب علم کی دانست میں تختہ الٹ تشادات کا لٹا گیا ہے جو معاشرے کو منطقی تبدیلیوں کی طرف لے جا رہے تھے، جو ٹھٹھا کر رہے تھے کہ "ہم بے ایمان لوگ" ملک کے دفاع کے ہم پر مزید "بے ایمانیوں" کے قتل نہیں ہیں۔ اور "ہم بے ایمان لوگ" انیم مہم، مگر ملک اور عوام کو آسودگی اور خوشحالی نہیں دے سکتے اور یہ کہ عوام کے اعتماد سے محروم کر دیئے جانے والے معاشرے، حکمتیں اور عقلیں انیم عموں کی طاقت سے باقی نہیں رہ سکتیں۔

منیر نیازی کی "نام نہاد" جمہوریت کے خاتمے نے ہمیں ایک بار پھر اسی مقام پر واپس لے آیا ہے جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

مظاہر الحق قادی کو ان کی پسندیدہ جمہوریت کا لٹو دے کر منیر نیازی نے اپنی "حقیقی جمہوریت" پسندنی کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ منیر نیازی کی مشرف پسندی اس شبہ کا ازالہ ہے کہ خدا خواست وہ جمہوریت پسند بھی ہے، "واقعہ یہ ہے کہ منیر نیازی ایک فاشٹ تھی ہے۔ جمہوریت سے اس کا دور دورہ تنگ کوئی واسطہ نہیں۔ مظاہر الحق قادی کے خلاف اس کے ریمارکس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نواز شریف حکومت نے انہیں ایک یورپی ملک میں سفیر مقرر کیا تھا اور منیر نیازی کو "انسدادیہ رنجی مظان" کے پیش نظر کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر نہیں بنایا تھا، جناب مظاہر الحق قادی جیسے پڑھتے دیکھتے شاعر ادیب اور معلم کا سفیر بنایا جانا سیاسی تعصبات کی بنا پر تو قابل اعتراض ہو سکتا ہے لیکن پاکستان کے ایک باصلاحیت شہری کی حیثیت سے ہم ان کی بطور سفیر تقرری کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ کر سکتے تو منیر نیازی نے مبینہ وقت پر چیلنج کر دیا ہو گا۔

ایسے سوچنے کی بات ہے، یہ منیر نیازی ہوتا کون ہے کسی کو شاعر یا غیر شاعر قرار دیتے والا؟ جس شخص کی اپنی شاعری متنازع ہو، یہ پتہ نہ چل رہا ہو کہ وہ جو دو چار اچھے شعرا کے نام سے منسوب ہیں اس نے کیسے کہہ دیے ہیں کیسے جید شعراء کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ فلاں کبھی شاعر نہیں رہا فلاں فرمایا ہے؟ "نام نہاد" جمہوریت پر پیدہ ہوتی کتنی کتنی کڑیاں ہیں تو معلوم ہی ہے کہ پاکستان کا چرچہ جناب احمد ندیم قاسمی، جناب قتیل شغالی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور جناب امجد اسلام امجد کو نہ صرف شاعر مانتا ہے بلکہ اکثر نے ان کا کام حفظ کر رکھا ہے، جناب قتیل شغالی کو تو ہماری کتنی سلیس کالاکر جوں وہی ہیں۔ جمہوریت کو معیار بنالیں (جس کا منیر نیازی دلداد ہے) تو قتیل شغالی سے بڑا شاعر پاکستان میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم جمہوریت یا جمہور کے اس فیصلے کو کیسے مسترد کر سکتے ہیں جو جناب احمد ندیم قاسمی، قتیل شغالی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور امجد اسلام امجد کو تو شاعر مانتا ہے۔ منیر نیازی کو نہیں مانتا؟ اس کا بہت ہی واضح مطلب یہ ہے کہ منیر نیازی ایک فاشٹ سوچ اور فکر کا آدمی ہے جمہوریت کی نفی کرنے والے کسی شخص کو کچھ اور ماننا جا سکتا بھی نہیں۔

منیر نیازی کے فاشٹ ہونے کی ایک سے زیادہ مثالیں اس کی ہر ذمہ داری سے لٹو کی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر اس نے کہا ہے کہ قتیل شغالی فرمایا ہے اسے وہ پادشاہ کہہ دینا چاہیے چونکہ منیر نیازی کو جناب قتیل شغالی جیسی مقبولیت اور عزت نہیں مل سکی اس لئے ان کا دربار کیا جاتا ہے منیر نیازی کی آتش حسد کا تھما ٹھہرا۔ امجد اسلام امجد کو اس نے اپنے "گوٹھے" کی ساتویں منزل سے نیچے پھینکنے کی بات کی ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ بہت چرب زبان انسان ہیں اور یہ کہ دولت کماتا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ منیر نیازی کی اس منطق سے کیسے اتفاق کیا جا سکتا ہے؟ امجد اسلام امجد اگر واقعی (جیسا کہ منیر نیازی نے کہا ہے) چرب زبان انسان ہوتے تو انہوں نے رفق شریکیتے تھوڑا سا کھن منیر نیازی کو ضرور لگا دیا ہوتا۔ نہیں لگایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ چرب زبان نہیں ہیں یا وہ منیر نیازی کو اپنی چرب زبانی کا مستحق نہیں سمجھتے۔ اور یہ کوئی ایسا ہوا کہ وہ نہیں جس کیلئے انہیں منیر نیازی کے "گوٹھے" کی ساتویں منزل سے نیچے پھینک دیا جائے، وہ ساری عالمی جنگ سے پہلے کی بات ہے، چرمی کے (فاشٹ) ڈکٹیٹر نے انہیں انکھیں ہی دکھائی شروع کی تھیں۔۔۔ طایرہ کے وزیراعظم جمیر لین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ نظر سے مل کر اس کی ریت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔۔۔ ان میں یہ ملاقات ہوئی تو نظر نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اس نے اپنی قوم کو کس قدر متقلب کر لیا ہے ایک شخص کو قریب بلایا اور حکم دیا کہ سامنے والی عمارت

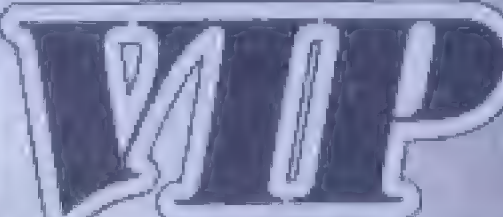
سے پھانگ لگا دے۔ وہ شخص عمارت میں نہ جا اور پھانگ لگا کر مر گیا۔ چیمبر لینی لڑ کر رہ گیا۔ اس عمارت کی سات منزلیں تھیں، منیر نیازی کے منہ سے امجد اسلام امجد کو ساتویں منزل سے نیچے گرانے کی بات آگیا تھیں۔ نظر کے پورے فاشٹ شعور کے ساتھ نفی ہے۔

جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف کے بارے میں منیر نیازی کا کہنا ہے کہ وہ نکال ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ وہ "نکال" ہوتے ہوئے تو شہر کے ساتویں آسمان پر چڑھ گئے مگر منیر نیازی "اور جمل" ہونے کے باوجود کو شہر کی ساتویں منزل سے ٹوچ نہیں انہو کا اور وہ بھی بے چارے امجد کو نیچے گرانے کیلئے، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ "قتیل شغالی باپ اور ست بیٹے ہیں، منیر نیازی اگر قتل منیر ہو گا تو فاشٹ نہ بنے گا، ایک اچھا شاعر بن گیا ہو گا، اپنے خود غلام ہونے کے ثبوت پیش نہ کرے گا، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب قتیل شغالی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور جناب امجد اسلام امجد کی شاعری سے استفادہ کرے گا اور اچھا شاعر کہنے کی کوشش کرے گا۔

﴿﴾ - ﴿﴾ - ﴿﴾

جب تک تم انسانی نسل میں پائی جانے والی حب الوطنی کو شکست نہیں دیتے، ہر سکون اور ریافت نہیں کر سکتے۔

(جارج برنارڈشا)



VIP INSURANCE AGENCY INC.

AUTO • HOME • LIFE • COMMERCIAL

- * Restaurant * Heavy Trucks
- * Bonds * Public Transportation
- * Livery * Workers Compensation

SARDAR MOHAMMAD NASRULLAH

President

Member N.A.L.U L.U.T.C Graduate

38-15 69th Street,

Wodside, NY 11377

Tel: (718) 426-5149

Fax: (718) 565-1481

علامہ بشیر حسین ناظم کیلئے 10 ہزار روپے انعام کی پیشکش

نامزدی

ہمارے ایک بہت بڑے گئے کرم فرما دو مت مریاں جناب رئیس اہم اکثر ہمیں اپنے مکاتبات گرامی سے فوائدے پہنچتے ہیں۔ مدت گزری ایک دلچسپ خط حضرت علامہ بشیر حسین ناظم سے "میرا اقبال" کے حوالے سے گفتگو پر مبنی انہوں نے لکھ لیا تھا جو علامت کے سبب ہمارے کالم میں دو وقت تک نہ آیا۔ چنانچہ اس بحث کو وہ "القلم" گرامی میں لے گئے۔ وہاں اختصار سے ضمیر اختر نقوی صاحب نے خط بھی شائع کیا اور جواب بھی۔ خیال کیا کہ رئیس اہم صاحب نے اہلیت تو ہمیں دی تھی وہاری کوتاہی کہ ہم ان کے زیر خیالات کو ہار کھین گئے نہ پہنچا سکے۔ محنت پر ایوں ہے کہ ممتاز نعت گو اور نعت خواں بشیر حسین ناظم نے رئیس اہم سے دو اور لن گفتگو فرمایا کہ "کوئی بات سے خدا علامہ یا خدائے سخن استاد شاعر نام مانی مقام حضرت حسین کی معرفت کی اس منزل کو ہمیں پہنچا جس کا حال علامہ اقبال کا یہ شعر ہے۔

در میان امت آں کیوں جناب
ہم چہ حرف قل ہو اللہ در کتاب

میں اہم نے کہا "بے شک علامہ اقبال معرفت اہل بیت کیا ارفع اعلیٰ منزل پر تھے مگر ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن شعراء نے اہل بیت میں مریں گزار دیں وہ اس علم و علم سے بالاتر تھے۔ خدائے سخن میر نہیں لکھتوی کہتے ہیں۔

دیکھا ہو اور شمس کیوں جناب
کہ کیا نہیں تھی سچ کلی آفتاب

میر ان کا یہ شعر خاکر رئیس اہم نے کہا کہ "ناظم صاحب انہیں کو اپنے مددگار نہ صرف عقیم شاعر باہر تھے بلکہ ایک عالم بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس پر بھی حسین ناظم نے کہا "خارج اثنارہ نے یہ کسی کو دیکھا نہیں مگر انہیں کے عالم ہونے پر مجھے شک ہے۔" اس کے بعد وہ "کیا آفتاب" کی بات چھوڑ کر "شمس" پر آگئے اور کہا کہ جس طرح عابدت عابد و عابدت باہمی طرح شمس سے شمس عادت ہے اور ہم اس نسبت میں مومن و غیر ممبر تہادی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "تو کچھ انہیں کی طبیعت اہم حال مقام کو "شمس" تھا ہے۔" ظفر اکبر تہادی بھی ناظم صاحب کی طرف نسبت لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں اور کبھی میری طرف۔ بشیر حسین ناظم نے مزید فرمایا کہ اہل اور لکھنے کے ساتھ وہ سے بڑی ہر کہ یہ ہو گئی کہ ہر لفظ برآں میر نہ کہ تھا اس کو موٹ نہ دیا۔ مثلاً آفتاب "شب" عربی میں مذکر ہے اور وہیں موٹ۔

میر حال رئیس اہم صاحب کا موقف تھا کہ علامہ اقبال نے جناب اقرار ہی ملائیت سے اچھی شاعری کی ہے وہاں انہوں نے اردو کے دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے میر انہیں کا بھی کمر مطالعہ کیا تھا کچھ عجیب نہیں کہ "کیوں آفتاب" کی ترکیب اقبال نے انہیں سے کتاب کی ہو تو اس سے کوئی اقبال کی نکل ہو جائے گی؟" اس خط کے جواب میں علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنے جواب سے "القلم" میں رئیس اہم صاحب کو لکھا کہ "آپ کی یہ بات بالکل وزن رکھتی ہے کہ اقبال نے میر انہیں سے خود عربی کی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "ماہ نو" کے انہیں نمبر میں اور اقم الجرونی (ضمیر اختر نقوی) نے اپنے ایک مضمون (شائع کردہ دوستانہ انہیں راولپنڈی) میں اس سلسلے میں گفتگو کی ہے اور گفتگو کی مزید گنجائش موجود ہے۔ "کیوں آفتاب" کی ترکیب اقبال نے میر انہیں سے حاصل کی ہے۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ

"شمس" ناظم صاحب کی اپنی علمی طبیعت کیا ہے "آفتاب" میں ہر ایک کا فتویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔ ان کی محنت کا نکتہ ان سے ان کی کم علمی خیال ہے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ عربی میں لفظ "شمس" موٹ ہے وہ "شمس" کو موٹ کہہ رہے ہیں۔ اب کیا اردو میں ناظم صاحب یہ نہیں کہے کہ "شمس" طلوع ہو رہی ہے "علاوہ ازیں انہوں نے شمس کو مذکر تسلیم کیا ہے۔ اس لئے اب اساتذہ کے قائم کے خلاف کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بشیر ناظم صاحب ایک لفظ "آفتاب" کا رد و رد ہے ہیں کہ عربی میں مذکر تھا اور اس میں موٹ نہ دیا، میں بہت سے افراد لکھ رہا ہوں کہ تمام لفظ عربی میں موٹ ہیں لیکن اردو میں مذکر ہیں۔ افعی، مجرہ، د، اجل، شمل، مضار، عقب، اقلق، قدیم، بد، یمن، جنوب، حیف، سلام، مقاب، عترت، فرس، و موی، انہیں؟"

اب ہے کسی کی مجال کہ ان فنکاروں کو اردو میں موٹ استعمال کر کے دکھائے۔ بشیر ناظم صاحب نے کیا رد کو بھی، لکھی زبان سمجھ رکھا ہے اردو کے ایسے سے خوبصورت ہیں۔ میر انہیں نے شمس کا لفظ ہر جگہ "شمس" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

مر یا ملا جو شمس کیوں جناب کا
سوا آہر کیا ورنہ آفتاب کا

علامہ ضمیر اختر نقوی نے موٹ مذکر پر خاصی بحث کی ہے اور بہت مدلل مثالیں دی ہیں۔ میر انہیں کے عالم ہونے پر بھی حجت دیتے ہیں اور بشیر ناظم صاحب سے پوچھا ہے کہ ان کے پاس "عالم" ہونے کو کون سا پیمانہ ہے۔ جس سے آپ کو یہ بتا دیتے ہیں کہ قتال شمس عالم ہے یا نہیں اور غیر اور غیر۔

آدم پر ہر مطلب اپنے طویل مدتی مکتوب کے آخر میں ضمیر اختر نقوی نے علامہ نعیم حسین ہاشمی کی ایک گفتگو کی ہے کہ اس کا کالم کا مدعا یہی ہے کہ وہ "انکس" کی ایک اور ساریاں علم تک پہنچا جائے۔ ضمیر اختر نقوی مدبر "الحکم" گزراہی کہتے ہیں۔

پندرہ شہر میں گھوم رہا ہوں ضمیر ہاشمی صاحب اگر ان اشعار میں یہ شہداء نکات کی وضاحت کر دیں تو "الحکم" کی طرف سے انہیں دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ (اشعار شاہک ہوں)۔

مشتاق کے سوا کوئی نہیں نگر نہیں
یہ شوق وصل ہے کہ کسی کو شہر نہیں

سندھ کی خاطر بھی ہے سہ سہ باب
جو ورا بھی ہو تو لہذا نہیں

زوروں سے ان کے شرعی سر زور ہے
مٹی طار ہے نسخہ کسی کرد ہے
تین کر کہیں کہ فوج تصویر دور ہے
یاں یاہن بھی قرط نکات سے زور ہے
کس طرح جھگڑا ہو وہ جوہر جو فرد ہے
جہاں خیال فلسفی ہر ذہن کرد ہے

تیرہا قتل میں تیرہ کے سوا نہیں
یہ وہ عظیم ہے جو کسی سے کھلا نہیں

کہتے ہی تھک رہتے ہیں جب طار سے مست
کتنوں نے دل سے محو کیا وعدہ است

دھن اس میں روم کا ہے نہ سلطان شام کا
دھن کی سب زمیں پہ ہے قبضہ الام کا

جب پادشہ میر عالم امکا کی دلی بادی
جاری ہو روج پاؤ قدم میں وہ لطف پادی

قاتل میں ہے غواں ازادی میں
کہتے تھے روز قتل ہمیں امید کا ہے دن

پوست سا صدف لگا کوئی نہم ملک نہ تھا
پہ کیا حرا جو حسن میں ان کے ملک نہ تھا

زمیں نہیں آنکھوں کو بھلا کیا اولاد
وہ دیدہ ہے نور ہے یہ مطیع الزاد

ایسا نہیں کوئی کہ دل ریش نہ دیکھا
دیبا کے کسی لوش کو ہے نیش نہ دیکھا

فرمایا ال اسے پھر عاقب و داء
ہے ذات خدا قادر و قیوم و تولد

مگر تہ ثنی لوح ثریا پہ کبھی ہیں
یہاں ہیں کبھی اور طافہ اطل پہ کبھی ہیں

نہ شرم سے بھلائے ہیں ترس ریاض میں
نہت سوار میں یہ بیضا دیبا میں

مست سے ہوا رنگ رخ ہوا کا نور
خبر بھی سے مراد ہے دیدہ سے نور

گھوڑا بھی نہ پھول کی برس پر پھڑی پڑی
کھلی گرد وہ قح نے جب گل پھڑی پڑی

ہے فرق پہ رسول کے گدے صاحب کا
دیکھوں قرن ہوا زحل و آفتاب کا

علامہ ضمیر اختر نقوی کی طرف سے "شہر فنی" پر انعام کی گفتگو ایک اور علامہ نعیم حسین ہاشمی کی ہے۔ اب دیکھئے دونوں علامہ حضرات میں فیصلہ کن معرکہ کیا ہو گا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ

سبح کہ لو پچھو غالب سے
تم بھی استاد ہو بھی ایک استاد



خیال کا سفر یا توارد؟

ناصر زیدی

کبھی بھڑاس کالم میں چہ بہ چہ زیدی، مرقہ، توارد اور "خیال کا سفر" کے عنوان سے اشعار کا انتخاب صاحبانِ وقت کیلئے کر دیتا ہوں۔ یہ سلسلہ توقع سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور کئی رسائل و جرائد اس کی نقل اپنے اپنے مقام پر لیتے ہیں اور ان کے کالم کیلئے بے تاب انتظار رہتے ہیں۔

خیال خاطر انجانب چاہے ہر دم
انہیں تھیں نہ لگ جائے ابھگنوں کو

کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ خدا نے سخن میرا میرے لفظوں میں "آبھگینوں کو نہیں" نہ لگنے دے مگر موضوع ایسا ہے، لہذا غائب کر

ہر چند ہو شاہد حق کی محکم
بہشتی نہیں ہے ہمارا و سائر کے بغیر

جنکی اعتقاد کا یہ کالم متقاضی ہے اس نے کہیں زیادہ اعتیاد میں لفظوں کے استعمال میں کرتا ہوں، پھر بھی اگر بعض اعتراضات ہمیں نہیں ہوں اور نیت پر شک کریں تو کیا کیا جاسکتا ہے؟ آج کے کالم میں کچھ ایسے ہی ملتے جلتے اشعار جنہیں میں مختار انداز اختیار کرتے ہوئے "خیال کا سفر" میں لکھوں گا۔ قارئین کی ضیافت طبع کیلئے درج کر رہا ہوں۔ عطا اللہ ہوں۔

مہر ہے کہ ہستی نیا تھی ہر
ان سب کے مجھے ہم بھی اب یاد نہیں

حضرت جوش ملیح آبادی

کیا لوگ تھے کہ جان سے لڑا کر عزیز تھے
اب دل سے جو ہم بھی اکٹھے کے ہو گئے

احمد فراز

مرے جو ہر قلبیں کے غیر، شہرِ بے ہوش کے صفِ آزاد
مثالِ حق میں لہنِ سعد کے انگڑے میں رہتا ہوں

خاور خضوی (مرحوم)

میں سر ہوں اور ابھی انگڑے پڑے ہیں انہوں
مرا جسکے ابھی کھینچا نہیں چلا

حسن نثار

دل کی بساط کیا تھی نگارِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دلکجِ جمال میں
مصابہ کبر آبادی

دل کی پرکھ تو نیا ہوئی دمِ جمال میں
کھلا گیا یہ پھول یونہی دلکجِ جمال میں
مصابہ کبر آبادی

ایک پتھر اوجھ آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے
رضی اختر شوق

میں کیسے مان لوں تم کو شہر
تسماتِ ہاتھ میں پتھر کہاں ہے؟
حسن اہمل مسرت

لہر میں تری نگینوں کے اس وطن کے چہرے
چلی ہے دم کے کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
فیض احمد فیض

کوئی چلنے نہ پانے سر اٹھا کر
یہاں دستور ہوتا آ جا رہا ہے
ذاکر سعید اقبال - سعدی

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو حشاش کروں
قہارِ شہر نے اپنے ہوئے دستانے
مصطفیٰ زیدی

سوچوں تو مرے قفل میں شامل ہے ایک شہر
دیکھوں تو آستین پہ کسی کے لہو نہیں
حسن اہمل مسرت

زندگی کیا کسی مجلس کی تھا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
فیض احمد فیض

آج انہیں سوچتا ہے یہ بھی کیا ہے زندگی
لگ رہے ہیں درد کے پیوند جس میں ہر گھڑی
سجاد مراد

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتفاقاً عجیب ہوں کہ میں!
خود کو چاہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

جون الیسا

عجب طرح کے لذت پسند ہیں ہم بھی
کہ مت گئے، تو سرت ملال بھی نہ ہوا

حسن اہل سرت

ہر چند میر ہستی کے لوگوں سے ہے نفور
وہ ہائے آدمی ہے وہ خاندان طراب کیا

میر تقی میر

فراز سب ملامت سے زخم زخم سی
نہیں مزاج ہے خاندان طراب جیسا ہے

احمد فراز

کبھی کبھی تو ہوشوں پر اک حرف صدارت جاتا ہے
بات مکمل ہو نہیں پاتی اور گلہ رو جاتا ہے

اسلم رائق

کبھی کبھی تو دامن میں اک سبک صدارت جاتا ہے
دینے والا کچھ نہیں دے پاؤں صدارت جاتا ہے

طارق نعیم

دیواروں سے مل کر روئے اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

قیصر انصاری (نجات)

دیواروں سے بانٹیں کرتا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

(اقبالی شاعر) قیصر انصاری

چھوٹی پاتی ہے اتار کی چادر
پاؤں باندھتے ہوں تو سر کھٹکتا ہے

جانش دہلوی

چادر لوقات کی جھگی نہ پوچھو
پاؤں جب ہم نے پھیلائے سر کھٹکتا ہے

ذہان کلیم

سر پہناتے ہوں تو گر جاتی ہے سر سے ریشم
اپنی دستار پہناتے ہوں تو سر پہناتے ہے

انجم پوری

کتنی مشکل ہوتی جاتی ہے حفاظت گھر کی
اس کی دیوار چھاتے ہوں تو در جاتا ہے

طارق نعیم

وطن کے لوگ سناٹے تھے جب وطن میں تھے
وطن کی یاد سناتی ہے جب وطن میں نہیں

انجم پوری

وطن میں آنکھ چراتے تھے ہم سے اہل وطن
ترپے رہتے ہیں غربت میں ہم وطن کیلئے

دشت گلشنوی

وہ شہید کہ دھوم تھی حضرت کے زوال
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کیا سے گھر سے

نواب مسیحی خان شیدا

کیا نکالوں کہ قصیدے آج کہاں دیکھا ہے
اگلی کہ وہاں تو اسی بات پہ بھگلا رہا ہے

منظر مجاہد نقوی

شہر میں آ کر پڑے والے بھول گئے
سب کی ماں نے کتنا زہر بچھا دیا

اسلم کوسری

ٹٹک بھڑک دیکھ کے رہا بھول گیا
تھی راتیں ماں کیلئے میں سوتی تھی

اقبال بحر اقبالوی

اور سے دیکھ کر جاتا رہے گلہ دل کا
اس اک نگاہ پہ نصرا ہے فیصلہ دل کا

قلق کھنوی

فکا گاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو گاہ میں شرف تو دہری کیا ہے

علامہ اقبال

ہیں اک نگاہ سے لگتا ہے قتلہ دل کا
وہ دہر دان تھا بھی وار کے دیکھتے رہیں

احمد فراز

494949

رباعی			
حوالات الیہ الکلام آزاد			
تھا	جوش	و	خروش
اتفاق	ساقی		
اب	زندہ	دنی	کہاں ہے
باقی	ساقی		
مے	خانے	کا	رنگ
روپ	بدلا	ایسا	
میکش	میکش	رہا	نہ
ساقی	ساقی		

میں مدد سے کی۔ ان شاعرات کو اپنا قد و قامت دیکھنے اور جانچنے میں بھی مدد ملے گی۔ جنہوں نے یہ دینا شاکرین ہائے کے شوق کے بل بوتہ پر دیکھی یہ دین شاکر کے ان دھنوں کا کچھنے کی کوشش نہیں کی جو ان کی شاعری پر لکھتے رہے ہیں۔ غلام محمد قاسم مرحوم کہتے تھے یہ دین شاکر ایک غریب سے اپنی موت کی خاطر بیان کر رہی تھی، جیسے اس نے اپنے بہت جلد مر جانے کی بھارت ہو چکی تھی۔

اسی کی ہائی چائے کہ یہ دین شاکر کے لکھنا بہت کم شاکر کا کہ ان کو ان کے دل جس کو ان کا ۱۸ انقلاب گرچہ وہ چھٹی لکھی ہو، اس کا اپنا وسیع کی ضرورت اس سے محسوس ہوتی ہے کہ مرحوم الہیاد و مرحوم کشمکش میں انگریزی زبان پر ہوا مطالعہ کرتی تھیں۔ یعنی شاعری قویہ کی جانب تعلق اردو میں کرتی تھیں اور بات چیت انگریزی میں، وہاں نظائری الیٹ کا اس سے تعلق رہتی تھیں۔ محکم کشمکش میں اسے اعلیٰ حد سے پر فائز تھیں اور آپ جانتے ہیں وہ اسے باطنی مددوں پر فائدہ اٹھا کر اردو میں پائی داری زبان میں کم ہی بات کرتے ہیں، عجیب لگے جو اگر قلم میں مرحوم کو اردو میں بات چیت کرتے دکھایا گیا۔ بہر حال یہ معاملات فلسفوں کی مدد پر ہے، انہم کو ان ہوتے ہیں کسی کو مشورہ سے والے سن اور میں بتائی گئی قلم مر باغیاب کا خیال آگیا تھا جس میں اللہ سے مرعہ سے مرعہ گوشہ کا کردار لیا گیا تھا، چہ نہیں فلسفوں نے غالب سے القام لیا تھا لہذا سعد مر سے۔ وہ تو اچھا ہو غالب اپنے بار سے ٹل جاتی جانے والی قلم دیکھتے تھے اس دنیا میں موجود نہ تھے ورنہ چپ چاپ رہتی میں غرق ہو گئے ہوتے۔

﴿﴾﴿﴾﴿﴾﴿﴾

سمجھا جس نے درگاہوں کے راستوں پر گندگی کے امیروں پر منوں چھ مچھوٹ لائی۔ شاعر تھا، مر گیا، شاعروں کو بھی مرنا ہوتا ہے، مثال ہائی تو ایک اچھی قلم اس پر بھی مثال چا سکتی تھی، اگر اچھی کے مجال اسالی کا کرنا کیا جائے تو لوگ انکلیاں نکالیں گے، ٹھیک ہے اگر اچھی کو قلمی صنعت میں بڑا مقام نہ ملے گا تو اگر اچھی میں قلمی ٹیلنٹ کی فراوانی سے تو ان کا نہیں لیا جاسکتا، کہیں کو قلم جو تو امر محبوب کے افسانے چڑھ لے، اور کچھ لے اس نے کہتے سکرپٹ لکھ دے گئے ہیں، مجال اسالی بھی ایک سکرپٹ ہی تھا، ان کے جہاز سے شاعر نہیں فروغ بیروانہ صورت شاعر جو نہیں فروغ ہی کی طرح ہوتی میں مر گیا۔ پچھتے پچھتے مر گیا کہ امریکہ میں کسی مشاعرے کا دعوت دہرہ حاصل کرنے کیلئے لابی کا طریقہ کیا ہے؟ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے ہی اعلیٰ قلمی سکرپٹ قبروں میں دفن کئے جاتے ہوں گے، کہتے ہی تسلیم نہ کئے جاسکتے، اسے کروار مٹی میں مل پئے ہوں گے، ہم نہیں جانتے ہیں تو باطن کیا تھا، ہم تو اکثر کے ظاہر سے بھی لگاؤ نہیں ہیں، مگر خوشی کی بات ہے کہ نے دین شاکر کی زندگی پر قلم ہانے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں، ان کے اشعار سے جو کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے اس میں ان کی محرومی کا ذکر کم فراوان ہے، اس قلم سے ان کو پورا سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کا باطن شاید پھر بھی پوری طرح کچھ میں نہ آسکے۔ دعا کرتی ہاں ہے کہ مرحوم کے ساتھ انصاف کیا جائے، کوئی ہے رجم ہی ہے انصافی ان کے کھاتے میں نہ ڈال دی جائے کیونکہ وہ اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی صفائی میں ہاتھ کر سکیں۔

یہ دین شاکر کی زندگی پر لکھی جانے والی گورنر قسم و صورت کے انصافی ہڈی کی تشہیر

COMMERCIAL MORTGAGE & LOAN

SAUD HUMAYUN KHOKHAR

INTERNATIONAL BUSINESS SERVICES USA COMPANY

■ www.intl-business.com

■ Mallroad.com

■ The dot com shopping sm

■ Mallrosdauction.com

■ Visit our auction and saur mond

2075 86th Street
Brooklyn, NY 11214
Tel: (718) 265-1372
Fax: (718) 265-1372



سب سے اچھا ریٹ
سب سے کم تر سروس

ON TIME

MONEY TRANSFER

اعتماد ضمانت اور دیانت کے اصولوں پر

مہنگے کے لیے سب سے کم قیمت کی گارنٹی

وٹامن ہومیو پیتھی سینٹر کے
ہومیوڈاکٹر افتخار چوہدری

وٹامن ہومیو پیتھی سینٹر کے بروکلین آفس اور کونستز آفس میں رقم آپ جمع کرائیں
اور کم سے کم وقت میں پاکستان آپ کے عزیزوں تک ہم پہنچائیں گے

Ph: 718-941-1400

Fax: 718-941-1093

Out of New York

800-388-0969

یہ ہے آپ کا اعتماد ہماری دیانت اور ضمانت

رابطہ کے لئے: رانا رشید اور محمد صابر

Queens: 72-15 35th AVE JACKSON HEIGHTS, NY 11372

Brooklyn: 1017 Cortelyou Road,

Brooklyn, NY 11218

کتابیات

”نیویارک میرے آگے“ پر ایک نظر

پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوقی

سید حیدر علی جو ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں اور ”سمری گورٹ“ کے عنوان سے نچھایا کہ سے شائع ہونے والے اردو مجلے ”پاکستان انکسپریس“ میں کالم لکھتے رہے ہیں اور فی الحال ”عمرانی عدالت“ کے عنوان سے ہفت روزہ ”عوام“ میں اپنا کالم تحریر کرتے ہیں۔ اب ان کالموں کا مجموعہ ”نیویارک میرے آگے“ کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ سید حیدر علی وطن سے محبت کرنے والے جو کس زبان کے مالک، مگر وہ پیش سے باخبر اور ثقافت طبعیت رکھتے ہیں۔ فرد کی حیثیت سے وہ مندرجہ بالا پیش اور خوش حلق ہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہے اور ان کا حسن اخلاق اس جتنے کو پہنچا کر حیران رہا ہے۔ اردو کی ترقی و فروغ کیلئے وہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان کے قلم میں رواں دوا ہے۔ ان کی تحریروں کے حصے پہلوؤں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن شخصی طور پر ان کے خلد میں اور عمل کی سطح پر ان کے فعال و مستعد ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی سوچ کی جھلک ذیل نظر تحریروں میں ملتی ہے جو خود اپنی خصوصیات رکھتی ہیں۔

پہلی اور دہائی بات یہ ہے کہ امریکہ میں مقیم ہوتے ہوئے بھی جہاں مصروفیت اور دل چسپی کے بڑا دل سامان ہیں وہاں انہوں نے نہ صرف اپنی زبان اور تہذیب سے اپنے دلی تعلق کو قائم و دائم قرار رکھا ہے بلکہ اس تعلق کا عملی ثبوت ان کی تحریروں میں۔ غیر ملک میں رہتے ہوئے ایک قصداً یہ ضرور ہو گا ہے کہ زبان اور تہذیب کے مرکزی احوال سے دوری ہو جاتی ہے۔ لیکن سید حیدر علی نے زبان اور تہذیب کے مرکزی وحال سے تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور قوی انداز سے یہ اعتنائی نہیں ہتی ہے۔ البتہ اس دوری کا فائدہ یہ ہے کہ نگار سے کی جی راہیں بھی کھل جاتی ہیں اور حالات و واقعات کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا انداز آتا ہے۔ سید حیدر علی نے اس لحاظ سے کی وسعت کا انداز بھی کیا ہے اور حالات و واقعات کو نئے زاویوں سے پرکھنے کا انداز بھی ان کی تحریروں میں بدرجہا حسن ملتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنی زبان و تہذیب کے ساتھ ساتھ سید حیدر علی نے اپنے ملک اور اپنے وطن و مسائل کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یوں کہیں کہ منظر کشی ہو، لیکن سید حیدر علی نے ”آئندہ جاڑ کی نشیں پر رہیں، الامیں“ کے مصداق میں نظر اپنے ملک اور اپنے ملک میں رہا ہونے والی صورتحال ہی سے فراموش کیا ہے۔ صحافت کے دائرے سے ان کی فکر روزمرہ کے واقعات پر بھی رہتی ہے لیکن وہ ان واقعات سے گزرتے ہوئے قوم کے مسائل کا تجربہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور کہیں جانے والی بات کہ دینے کی انتہا مستعد آتے بھی ان میں ہو رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو کا ماحول، حالات حاضرہ کا جائزہ ملتی ہیں۔ مرکز بالذات نہیں۔ وہ فرد اور ماحول کے رشتوں کو بھرپور جانچتے ہیں اور انہیں ذات سے جدا کرنا بھی پختہ کی خواہش رکھتے ہیں۔

تیسری اور بہت اہم خوبی جو سید حیدر علی کی تحریروں میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ معاشرے کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے انسانی کائنات کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کی تحریروں میں معاشرے اور انسانوں کے تعلق کو پیش کرتی ہیں۔ اس تعلق کو دوبارہ کے ویرانے ہونے اور مستعد کرنے ہونے کی باتوں میں نہیں، اپنی ہی سوچ کی روشنی میں رقم کرتے ہیں۔ انسان ان کے نزدیک حیرت انگیز مخلوق ہے اور اس کے اعمال کی نیرنگی بھی حیرت خیز خصوصیات رکھتی ہے۔ جہاں وہ معاشرے کی خصوصیتوں کو سمجھتے ہیں۔ وہاں انسانی فطرت کی وہ قہرانی اور انکار گئی بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ پھر ان کا انسانی اعمال کو معاشرتی پس منظر سے منسلک کر کے دیکھنے کا مصداق ان کی تحریروں کو زیادہ قابل قبول مانتا ہے۔

سید حیدر علی کی تحریروں میں لائق مطالعہ ہونے کا جو انداز ملتا ہے اس میں ان کی مسخرانہ لہجے اضافہ کر دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں مسخرانہ لہجے کے جو شکے پھوٹتے ہیں وہ ان کی تحریروں کو جاذبیت اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے الگ ہو کر حالات کا مشاہدہ کرنے کی جو خصوصیت رکھتے ہیں اس سے ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی آتی ہے اور معاشرتی تنقید بھی۔ اس معاشرتی تنقید میں وہ مندرجہ کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ایس الی بال (Horace Walpole) نے کیا خوب کہا تھا کہ ”اینان کیلئے جو سوچتے ہیں کا میڈی ہے اور ان کیلئے جو محسوس کرتے ہیں ٹریجڈی“۔ سید حیدر علی کی تحریروں میں انہیں متواتر پر سوچنے اور محسوس کرنے کا امتزاج ملتا ہے اور یہاں ان کی تحریروں کا ادبی نصف نمایاں ہو جاتا ہے۔

سید حیدر علی کی انہیں تحریروں میں آئی صورت حال اور یادیں مل کر ایک حاشیاتی نقش قائم کرتی ہیں، اسٹیفن اسپنڈر (Stephen Spender) نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ ”آئندہ غزال، ذکی افسانہ نور، افق کے سیال تھا کی تو شہد“۔ چنانچہ سید حیدر علی کی آنکھ بھی یہ دیکھتی ہے اس میں مویج خیال کا اضافہ کرتی اور ایک سلسلہ شبیہ خیال قیام کرتی ہے۔ ان کی خیالی آفریں موجودہ اور گزشتہ ماحول کے سیال خطوں کے امتزاج سے نئی ترکیب پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے مثال کے طور پر ان کی بیسی یا سمین کیلئے انجی ملک میں پیدا ہوا چڑیوں کا ہوا ڈانکھ ک پڑ تالی کر تالور پھر بر صغیر کے کسی قلم کی موسیقی کی دھن پر انقص کر رہا ہے۔ لیکن یادوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ اپنے گھٹن کے ماحول کے نقوش جاذب کر تالور اس فیصلے پر قائم ہو تا ہے کہ ”یا سمین پارک میں اس وقت تک جاتی رہے گی جب تک درجہ حرارت 40 ڈگری فارن ہائیٹ سے کم نہ ہو۔“

سید حیدر علی نے ان ایچ بیس کا ذکر کیا ہے جن کی تحریروں اور ایک مختصر عرصہ کیلئے ان کی رجسٹری نے خود ان کے قول کے مطابق زندگی میں بہت دور رس اثرات پھوڑے ہیں ”ان اثر کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ سید حیدر علی بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہم

مستقبل میں ایک معاشرہ ایسا تشکیل دیتے ہیں ضرور کامیاب ہو جائیں گے جن میں است پات، صوبہ و زبان کا پہلی نہیں ہو گا۔

کلیوں کی فکر جات رہ گئی تو یاد رکھیں کہ میں بھی منعقد ہوتی ہے اور کراچی میں بھی۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے شاید دونوں جگہ بے حد قریبی عام ہے۔ سید حیدر علی بڑی دردمندی سے کہتے ہیں کہ ”صرف زبان ہی طرح سے کوئی اپنی تہذیب یا زبان کو فروغ نہیں دے سکتا۔“ تو اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ ”جو قوموں اپنی قومی زبان پر عبور حاصل نہیں کر سکتا، وہ ہی کسی اور زبان اور نہ ہی کسی اور شعبہ میں خاطر خواہ کامیابی یا کامیابی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔“

سید حیدر علی نے امریکہ میں بھی پاکستانیوں کی ہنگامہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے طرک کا تذکرہ کیا ہے کہ امریکہ کے ساتویں فری ہیرس کو مشرق وسطیٰ سے فوری طور پر بلا کر کوئی آئیلینڈ میں انفرامہ اڑا دیا جائے ”تا کہ پاکستانیوں کی پریڈیسیلے میں ہونے والے ہنگامے یا کسی بڑے صورتحال کے موقع پر فوری طور پر اپنی کی جاسکے۔“ مگر سید حیدر علی ان لکھنے والوں میں سے نہیں جنہیں ساری زبانیاں اپنی قوم میں اور ساری قومیں دوسری اقوام میں نظر آتی ہوں۔ وہ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ اس سال انڈیا پنجم سفید فاموں کی تنظیموں نے ”گنڈہ شت تین ماہ کے مختصر عرصے میں سیاہ فام لوگوں کے 45 کھیلوں کو نذر آتش کر کے مکمل فاکسٹر کر دیا۔“

سید حیدر علی نے سیاسی سلیبیڈرائیوں پر بھی اپنے افسانہ ساز اور خیال آرا انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ لیکن ان کی مثبت سوچ ان سے یہ بھی کھلائی ہے کہ آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ آپ مزدور ہیں، عوامی شہر نہیں۔ ”وہاں وہ اہم ظلم میں بھی وہ اپنے ملک کے لیے پروٹسٹیں ڈالتے ہوئے کہ کھیلواتے ہیں کہ ”میں دشمن کے جی سے تیار ہوں وہاں آئی بھی صرف دولت کو خدا تسلیم کیا جاتا ہے۔“

ان کی نظر تنقید جہاں دیکھیں وہاں ملتی ہے وہاں امریکہ کی آزادی کے مثبت اثرات کو نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ کہتے ہیں کہ کون انہیں منع کرتا ہے ”دور کی جانے والی ان فروخت کیا کریں لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے۔“ اہلیہ انہوں نے اس دوسری تہذیب کے سامراجی رخ، دہشت نام، غلطی جنگ اور قوموں کی جدوجہد آزادی کی مخالفت کو پیش کر کے توازن برقرار رکھا ہے۔

سید حیدر علی کے بعض پہلے کہیں ایک سماج کے کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں ان سے ذہنی اسباب کا سامان ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اس کردار میں بے شمار ایسے افراد بھی ہیں جو وہاں اور دنیا کی طرح نفس فیک میں مقید ہیں۔ ”اگر لوہے کیس میں رشوت خوری کا مقابلہ ہو تو اس میں پاکستانی طوائف ضرور حاصل کرے گا۔“ جب ایک اخباری نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ محترم آپ نے کوئی مچھلی پکڑی تھی انہوں نے جواب دیا کہ پلیز ہمارے ٹیکسٹری سے دریافت کر لیجئے۔ ”رہے پاکستان میں ہو اور پوچھتے ہو نہ ماکہ صدر کون ہے۔ بے غیرت ا۔“ لیکن میں اسی پر جتنے لکھنے سے بھاگنے پر مارا کرتی تھیں اور حکم چپ بھی مجھے لکھتے یا پڑھتے دیکھ لیتی ہیں تو ان کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ چودہویں صائب کا یہ نظریں میں گروہری استور ہے جہاں اشیائے صرف پاکستانی شہر اور قبضہ جی کہ گرین ہاؤس اور سوشل سیکورٹی کارڈ بھی فروخت ہو جاتے۔ یہ اپنے پاکستان کے صنعت کاروں کے ہنر کا کمال ہے کہ ہزاروں تیار شدہ اشیاء میں اس کی اصلیت کا تصور رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہاں کے رہنے والے نے نیلی درجہ میں بیٹ میں چارٹک، ملبوسات میں کپاس روڑہ میں پانی جتنی کہ پانی میں منی کی خواہش رہتی رہتی رہتی ہے۔

سید حیدر علی ایک طویل زمانے سے انجی ملک میں آباد ہیں۔ زبان کی سرمدوں میں زبان بھی توسیع ہو رہی ہے اور ملک کے پانی سے و علی اولی زبان کا تصور اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اب اس میں متعدد دریا ہیں، متعدد دریا کے پانی بھرے متعدد پار کی ہزاروں کالیں، ایک ایک بھی شامل ہو تا ہوا ہے۔ سید حیدر علی نے ان توسیع میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً پھونڈہ بسطنی ہے اصلی باتیں کر، جتنی گھڑا اور ملک ان مقامات پر استعمال کرتے رہے ہیں جہاں قریب انہی لفظ ”پاکستان“ سروجہ اردو میں آتا چلا رہا ہے۔ یہ زبان میں ترقی اور اضافے کی ایک صورت ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہیں جو زبان کی جانب زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔ اردو کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کا عالمی معیار بنانے میں بھی اردو کے شیعہ ائیس کو حصہ لینا ہے۔ زبان کی وسعت کی افادیت کو قبول کرتے ہوئے بھی معیار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سید حیدر علی اور امریکہ، بڑا طائفہ، غلطی ممالک افریقہ کے بعض حصوں، کناڈا میں اردو لکھنے والوں کو اردو زبان، صوفیاء اور ادب کی نئی تاریخ بنانے کا موقع ملا ہے جو برصغیر کی زبان و ادب کی تاریخ کی طرح ایک نواں بن جائے گی۔ یہ طائفہ اور بعض دوسرے ممالک میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ جب امریکہ میں اس سے نواں لے گا جائزہ لیا جائے گا تو سید حیدر علی اور ”نویاد کہ میر سے آئے“ کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔



خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا نے تجھے بگاڑ کر بنا نہ گیا

پاس ریگازہ چنگیزی

اردو شاعری کی عظیم، قد آور اور

منازعہ شخصیت کے ”جرم و سزا“ پر

ماہنامہ زاویہ

کی خصوصی اشاعت بہت جلد پیش کی جا رہی ہے

اردو رپورٹاژ کی ایک تاریخ

پروفیسر اشرف بخاری

جی پوچھتے تو پروفیسر ظہور احمد انمولان نے رچ، پڑا، لکھاری کی تاریخ لکھ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے وہ اب کے ایک ایسی صنف ادب پر قلم اٹھا رہے ہیں جس کا کوئی اور چھوڑ نہیں۔ ”نئے لہجہ اور نئی خبر ہے نہ اختلاص مضمون“ جس کی اب تک کوئی منطقی تعریف متعین نہیں ہو سکی جس کے موضوعات کے تنوع اور بے اندازہ وسعت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس کا اندازہ کلچرل پیچیدہ مگر اختیار ازل سے لے کر اب تک چھپلا ہوا ہے اور پھر ہمیں اس قیمتی صنف پر غور بھی آنے لگتا ہے کہ اب تک اس کا شمار سب سے تحقیق نہ ہو سکا اور نہ یہ کہ یہ کس جنس سے تعلق رکھتی ہے۔ چند روز ہوئے اردو کے ایک دارگہ خاطر اور ادیب کے بارے میں کسی نے بتایا کہ ”وینٹر ٹیم کو“ بخیر صنف تھن ”لکھا کرتے ہیں۔ ہم رپورٹاژ کے بارے میں اس حد تک تو قیادت پر ہاتھ نہیں لیکن پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ”عالم ہمہ افسانہ دار لکھتا“ معشوق کی کمر کی طرح کوئی خود دین اس کی مٹی کا سراخ اسے دیکھتے تو اسے دیکھتے دہشت گرد کہیں کہ ہے جنس ہے ”غور فرمائیے جس صنف ادب کے ”ذائقے“ ایک وقت خاکہ نگاری، سفاقت، انصاف، تاریخ، آپ بیتی، سفر نامہ، مکتوب لکھنی، جلسوں جلسوں اور میلوں میلوں کی رپورٹنگ، احوال زندگی، بھٹی شہادتوں، اولیٰ شخصوں کی روداد، تقریریں و بیانات، مہم جوئی، علمی و تحقیقی سفر، حج و زیارت مقدسہ، تراجم و فہمائے کتاب، شملہ کا نفرنس اور دیگر پاکستان سے جانے ہوا تو وہ صنف ادب کہلائی۔ یہی وہ تو لکھو صفت بلا ہو گئی تو اردو کے اسی چٹل پائیکڑے اور بھڑا جھکاڑ کی تاریخ ظہور احمد انمولان نے لکھی ہے اور انمولان کی بات ہے کہ خوب لکھی ہے اور پھر پور لکھی ہے۔ مختصر آراء اور محکم تحریکات سے اس دنگل سے گزر رہا ایک کسان نہ تھا لیکن وہ آسانی اور سلامتی سے گزر گئے۔ انمولان صاحب نے اس کتاب کے مولد کی قرائی میں کیا کیا پانچ بیٹے، کن کن کوئلوں کے دروں کو بچھا کیسے کیسے اور کن کن بولہ لاک، انتخابات سے گزرتے یہ صرف وہی شخص جانتا ہے جسے تحقیق و تحقیق کی کھانا نیوں سے پالا ہوا ہو۔

جس بیابان خطرناک سے ہے اپنا گھر
صحیحی قافلے اس دم سے کم گزرے ہیں

اس تاریخ میں انمولان صاحب نے بڑے استقلال مزاج سے کام لیا ہے جانفشانی اور محنت کا حق لو لکھ دیا ہے۔ صرف ایک نظر کتابیات اعلیٰ حصے پر ڈال لیجئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا تصنیف و تالیف کا حشر کیا ہوتا ہے۔

دیباچے میں انمولان صاحب نے رپورٹاژ کی جن دو تاریخوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک پروفیسر عبد بخاری کی مختصر سی تاریخ اور دوسری کبھی ریسرچر کا رطلات مگی کا ایک نفل کا

مطبوعہ مقال ہے جس میں رپورٹاژ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری نظر سے نہیں گزریں لیکن ان کے شمولات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مؤلفین نے بہت محنت آمیز انتخاب سے کام لیا ہے یا پھر یہ کہ اردو رپورٹاژوں کی ایک بڑی تعداد تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ چاہے کچھ بھی ہو یہ ان تاریخوں ایک ایسا نقص ہے جس کی کوئی تہو ملی نہیں کی جاسکتی۔ ان کے مقابلے میں انمولان صاحب کی تاریخ زیادہ جامع، زیادہ مکمل اور زیادہ بھرپور ہے جس میں رپورٹاژ کی مدد بہ عمد ترقی اور تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف العمد گزریں کو خوش اسلوبی سے جوڑا گیا ہے۔ ان میں لکھنے والوں کا تعارف بھی ملتا ہے اور رپورٹاژ کا کچھ منظر بھی ایسا گر گیا ہے۔

یہ جو ہم نے لپ کر کہا کہ انمولان نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے تو اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ انمولان نے ایک ایسے موضوع کی تاریخ لکھی ہے جس کے بارے میں اکثر کا کہنا سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے کہ ”گور کو سلجھا رہا ہوں اور سر ملتا نہیں“ میرا ادیب نے ”پیانہ قحط“ میں اس کی تعریف پیش کی ہے اور کوئی بھی یہ گروہ پیشانی نہیں کر سکتا کہ اس کی حدود کیا ہیں اس کی پرکھ بچان کا معیار کیا ہے لکھنے والوں نے اس قدر بے رعب اور ابھی ہوئی تحریکات لکھی ہیں کہ رپورٹاژ کی حقیقت و سبب کثرت تعبیر سے خواب پریشان بن کے رہ گئی اور انمولان ”خمس گرہن“ کے اس چکر میں قاری کے ذہن میں یہ سوال کھیلاتا ہی رہ جاتا ہے کہ رپورٹاژ ہے کیا ”جی پوچھتے تو اس سوال کا تحقیقی حشر جواب دہ انگریز مصنف ہاں کہیں بھی نہیں دے پھلایا جس کی کتاب گور پورٹاژ پر اب تک لکھی جانے والی سب سے مستند اور جانبار رپورٹاژ پر وہ تصنیف قلم ریا گیا ہے اب جو مشکل انمولان صاحب کو پیش آئی یہ تھی کہ وہ کس تحریر کو رپورٹاژ سمجھیں کہاں سے آغاز کریں کے شامل کریں گے نکالیں چنانچہ کوئلوں کے اس عالم میں اگر ایک طرف انگریزی تاریخ نے انہیں رات سبھلایا تو دوسری طرف ان کی اپنی سلامتی طبع کام آئی رپورٹاژ کی معنوی مناسبتوں اور دیگر خصوصیتوں کو نظر میں رکھ کر انمولان نے مولوی اقبال علی کے سفر نامہ پنجاب کو نقطہ آغاز بنا دیا یہی مولوی اقبال علی ہیں جن کی انگریزی، الٹی اور ذوق نویسی کی حالی نے حیات جلا دی ہیں بہت دیر دی ہے اقبال علی کا سفر نامہ پنجاب اصل میں سر سید مرحوم کے پنجاب کے سفر کی داستان ہے یہ مرحلے طے کر لینے کے بعد انمولان نے رپورٹاژ نگاروں کے بارے میں بھی خاص معلومات فراہم کر دی ہیں اور کچھ ایسی رپورٹاژوں کے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن میں بہت سی دستبردار زمانہ کے ہاتھوں اب عوام تو کیا خواص کی رسائی سے بھی باہر ہیں۔ ایسے نوادرات کو کتاب کی صورت میں محفوظ کر دینا بہت بڑی خدمت ہے۔ یہ دیکھنا ہی ہو گی اگر کتاب کے اس پہلو کی تعریف نہ کی جائے کہ اپنے مجموعہ تصانیف اور بھرپور مولد کے اعتبار سے یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے اردو ادیب کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہو

اردو شعر و ادب کے چار ستون

پورے اردو ادب کے تکیوں میں سے ہیں ان کا ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چار ستون ہیں جن پر اردو ادب کی عمارت قائم ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔

ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔ ان کے بغیر اردو ادب کی عمارت کی تعمیر ناممکن ہے۔



ایک تاریخ ساز تصویر:
شلی، میر مهدی مروج، شمس الامیر اللہ تسلیم اور حالی



NEPTUNE PHARMACY

**3080 Coney Island Ave,
[Btwn. Neptune & Oceanview Aves]
Brooklyn, NY 11235**

**We offer the best discounted
prices on all prescriptions and
"OTC" Drugs in town.**

**10% Discount for Medical
Professionals, Students and
Senior Citizens.**

Tel: 718-332-5263 Fax: 718-368-2710

Notary, Fax & Photocopy is also Available.

We Accept Medical Also



SHAH JEE MOTORS

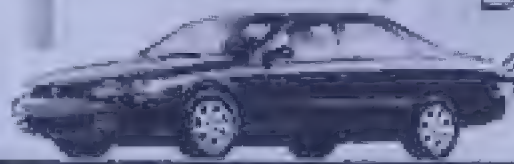
Our Name Means a Great Deal

شاہ جی موٹرز

لیمو کمپنیوں کے ساتھ
کنٹریکٹ اور ریڈیو لیز
کیلئے ہم آپ کی مدد
کر سکتے ہیں۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں!

ڈالنگ کیلئے اگر آپ کے پاس بل چلی،
بل فون، جاب لیٹر، 1-99 پے منٹ،
لیکس ریٹرن بھی نہیں ہے تو کوئی بات
نہیں، ہمارے پاس تشریف لائے۔



Timing

9:30am - 8:30pm

- ★ Best Price In Town
- ★ Free Services for Radio Lease
- ★ Contract with Limo Companies
- ★ After Sale Warrenty
- ★ Trade In
- ★ Bank Financing Available

کب تک ریٹ نہیں ہے یا طرف ہے
کوئی مسئلہ نہیں، ہم حاضر ہیں

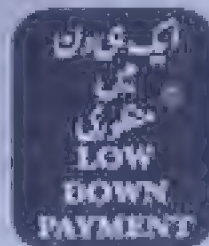
No Credit / Bad Credit
Slow Credit / Bankruptcy

NO PROBLEM

گھڑی اور قیمت کی گارنٹی کا نام

شاہ جی موٹرز

ویک فنانسنگ،
بھرتی میں سرورس،
ٹی ایل سی پلیٹ کا
انتظام ہے۔



23-02, 37th Ave, L.I.C., NY 11101
Ph: 718-786-1787 718-786-1118 718-786-1515
Fax: 718-786-4882

PUNJAB MOTORS, INC.

Used Car Dealer

Best Prices in Town

سوال جواب

کچھ ہو گیا ہے ؟

کچھ میں ہو گیا !

کچھ ہو دے گا ؟

کچھ میں ہوتا ؟

کچھ نہ کچھ ہو نہ ای رہتا ہے
جو توں چاہتا میں وہ میں ہوتا

ہو میں سکا

کرنا چندا ہے

حق دی خاطر لڑنا چندا ہے
جیوں دے لئی مرنا چندا ہے

مستور بکائی

Financing Availabe

Open Weekends

67-02 Queens Blvd. Woodside. NY 11377

Tel: 718-898-1800 Fax: 718-898-1400

www.punjabmotor.com E-Mail: punjabmotor6702@aol.com

LAW OFFICES OF
SHAKEEL H. KAZMI

US IMMIGRATION, CITIZENSHIP AND APPEALS,
CANADIAN IMMIGRATION, REAL ESTATE, BANKRUPTCY,
CIVIL & CRIMINAL CASES, BUSINESS CLOSING,
DIVORCE, PARTNERSHIP & CORPORATIONS

ALL KIND OF IMMIGRATION SERVICES

IMMIGRATION Through Employment,
Through Employment, Relatives, Investment and
Political Asylum.

NON IMMIGRATION VISA

Tourist, Student, Investors, Temporary Workers &
Executives, Work Permit, Green Card, Sponsorship
For Husband, Wife & Children, Different Categories
of VISA

For all your legal matters

شکیل ایچ کاظمی اٹارنی ایٹ لاء

یو ایس امیگریشن، سٹیزن شپ، کیٹیزین شپ، امیگریشن، ریکل اسٹیٹ، ہیٹ کرپس، دیو ایٹی اور
فوجداری مقدمات، بزنس گھوڑنگ، ازدواجی مسائل، پارٹنرشپ اور کارپوریشنز، مالک اور کرائے
دار کے مسائل، جائیداد کی خرید و فروخت، مختار نامہ، وصیت نامہ، ٹیکس سے متعلقہ کیمز۔

ACCIDENTS

پچس کر کرنا، میڈیکل میل پر ٹیکس، آنوائسڈنس، کام کے دوران حادثے، پرسنل انجری اور
ایسیڈنس کیمز، میں فیس صرف کامیابی کی صورت میں لی جاتی ہے۔ حادثہ کسی بھی نوعیت کا ہو موٹر
قانونی امداد آپ کے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہے

LEGAL PROBLEMS

BIG

OR

SMALL

CONSULTATION

FREE

* **72-28 BROADWAY, SUITE #4F, JACKSON HEIGHTS, NY 11372**

Tel: 718-446-7474, Fax: 718-446-8416

* **67 WALL STREET, 21ST FLOOR NEW YORK, NY 10005**

Tel: 212-269-7474, Fax: 212-509-3537

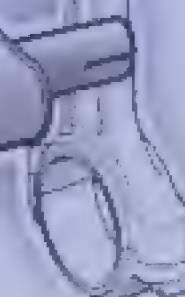
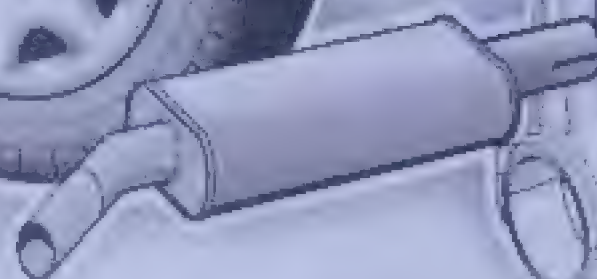
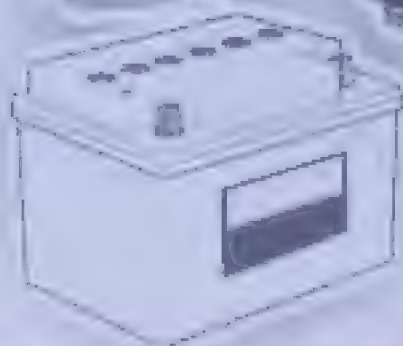
PUNJAB



AUTO REPAIR & TOWING



*Low Price & Fully Guaranteed
Open 24 Hours - 7 Days a Week*

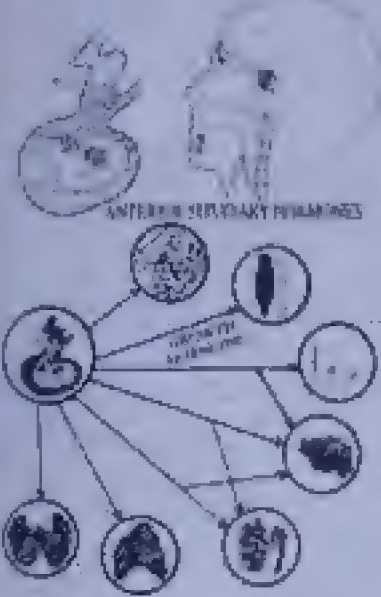


CONTACT: HAMID

134-15 Rockaway Blvd, Ozone Park, NY 11420

TEL: (718) 322-4100

ATTACH CLAND AND ITS SECRETIONS



اب بڑھاپے کا علاج ممکن ہے جب تک زندہ رہیں، جوان رہیں



پتھ فارمولا

میڈیکل سائنس کی اس صدی کی حیرت انگیز دریافت

یہ انگلیزہ جراثیم کے مطابق جوانی واپس لانے اور جوانی کو بڑھانے پر امریکہ اور یورپ میں ہونے والی تحقیق کے بہت حوصلہ افزاء نتائج برآمد ہوئے ہیں، انسانی گردہ، تھوہار، مون کے اثرات ان لوگوں پر بہت حیرت انگیز اثرات کے حامل رہے ہیں جو گردہ تھوہار، مون کی کمی کا شکار تھے۔ مگر تھوہار، مون انسانی جسم میں قدرتی طور پر **PITUITARY GLAND** سے پیدا ہوتے ہیں جو مسلمان، جلد اور بڑائی کی افزائش کا سبب بنتے ہیں۔ ایک خاص عمر کے بعد جب یہ ہارمون پیدا نہیں ہوتے تو جسم انسانی کے مسلمان پیدا کرنے لگتے اور جلد پتلی ہونے لگتی ہے۔

مسلسل تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اگر گز و تھ ہارمونز کی کمی کے فکار گوی کو گز و تھ ہارمونز دیئے جائیں تو اس میں مسئلہ گوشت پرست بڑی و غیرہ کے بڑھنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور چربی کم ہونے لگتی ہے۔ میڈیکل کالج کیمپس اور دیگر ان پیجرز میڈیکل سینٹر ملوکی میں ہونے والی تحقیق کی رپورٹ کے مطابق ستر سال کی عمر کے کچھ افراد کو بچنے میں تین ہزار انجکشن کے ذریعے گز و تھ ہارمونز اتنی مقدار میں دیئے گئے جس قدر جو ان میں انسانی جسم خود پیدا کرتا ہے۔ چھ ماہ کے بعد ٹوٹ کیا گیا کہ ان کو میوں میں 8.8 فیصد گوشت پرست میں اضافہ ہوا اور 14.4 فیصد چربی میں کمی واقع ہوئی۔ 7.1 فیصد جلد کی موتائی بہتر ہوئی اس کے علاوہ رینج کی بڑھنے کے ذریعے جسم میں 1.6 فیصد موتائی میں اضافہ ہوا اور ان کی طاقت بڑھی اور عام طاقت میں اضافہ ہوا۔ تحقیقات کرنے والوں کا کہنا ہے کہ گز و تھ ہارمون کے اس علاج کی بہ دولت ان افراد کی عمر میں کمی خاطر سے اس سہلی کا فرق پڑا ہے۔

تحقیقات کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر راجن RUDMAN کی نواکھینڈہ جہل آف میڈیسن میں پھینٹ والی ایک راج رستہ دوسرے قوی اور بین الاقوامی جرائد میں بھی تھیں، اس حیرت انگیز کامیابی کا ذکر دوسرا سنس نیوز لیٹر پر ہو رہا تھا۔ لیکن وہی ڈیوارک کا قشریہ تسلیہ میگزین، ڈاکٹر اور ڈاکٹر میگزین میں بھی پھیلا۔

جراثیم نے لکھا کہ گردِ تھو ہار مولن تھو پانی سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حبابی طور پر گردِ تھو ہار مولن کی سطح کا باہمی تعلق ہے اس وقت انسانی جسم کو جو ہار مولن گردِ تھو کی ضرورت پڑتی ہے اس کی قیمت 113,800 امریکی ڈالروں کے لیے کافی ہے اور ان کے لیے کافی طریقہ تمنا انجکشن فی وقت سے جو صرف امیر لوگوں کے لیے ہی کی جاتی ہے۔

اس کا عمل یہ تھا کہ کیا ہے کہ کوئی ایسی چیز دریافت کی جائے جو PITUTARY GLAND کو متحرک کر سکے تاکہ وہ خود کو تھوہاروں سے بچا کر لے سکے۔ اس کیلئے نچرل یونٹ فار موٹو بھرتی متبادل ہے کیونکہ حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ قدرتی طور پر پائے جانے والے (80) ایسیٹو ایسڈ ایسے ہیں جو انکلیشن کے ذریعے نہیں خود اک کے طور پر کھایا جائے تو یہ جسم کے اندر جاکر PITUTARY GLAND کو متحرک کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر GROWTH HORMONE کی انڈانکس شروع ہو جاتی ہے۔

YOU'YH FORMULA جو تمہارے مولا سے کیا توقعات والہیہ کی جاسکتی ہیں

عام طور پر یہ تصور اشتعالی کرنے والوں کا جانتا رہا ہے کہ پتیلے ہارور، جسمانی قوت میں اضافہ محسوس کرتے ہیں، مگر قیام اور پی سکون فیض آگئے گلشن ہے لہذا بہن میں دباؤ کی حالت کامقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو رہتی ہے۔

جدا دوسرے نام کے استعمال سے ہجوم کے مسخر میں مضبوطی اور فحشی محسوس ہوتی ہے اور یہ فی الواقع مادے کسی قدر غصے انگیز ہیں۔ جلد اور پھرے کی ظاہری صورت میں ہستری کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

تیسرے ماہ کے استعمال سے جسم کے مسئلہ کو گوشت بنی اور چست کی افراط کا فرق محسوس ہو رہا ہے۔ چربی والا حصہ ٹھٹھکے سے مسئلہ نمایاں ہونے لگتے ہیں اور جسم سہول ہو تا شروع ہو جاتا ہے اور زندگی میں جراثیمی باکٹریا محسوس ہونے لگتا ہے۔

یہ تیسرے صیغے کے بعد مجھ کی صحت کی بھڑکی کا عمل مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ بلا حیاپ کی دوا بھی کاسٹر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل مسلسل اور درجہ بدرجہ اعلیٰ ہوتا ہے اور بالآخر کچھ وقت بھی لیتا ہے اس لئے یہ دوا عمل سے تھوڑا سا دور رکھے۔ عمل کی رفتار میں کمی ہوتی ہے جب عمل اثرات مرعب ہوتے ہیں۔

FOR FREE CONSULTATION **Onsite:** 718-553-0646 **BKLN:** 718-941-8155 **Out Of New York:** 1-800-955-1710

72-15 35TH AVE. JACKSON HEIGHTS, NY 11372

1017 Corgelou Rd., Brooklyn, NY 11218

Shahzada

Super Kernal Basmati Rice



The World's Finest and Most Aromatic Rice

Quality to Taste

Shahzada

Distributed by:

Advance Food International Inc. Tel:(718)482-0123 • Fax:(718)482-4305

Habib American Bank



Member FDIC
A New York State Chartered Bank

The Local Bank with International Experience

Habib American Bank offers personalized services for its customers

- | | | |
|-------------------------|---------------------|-----------------------|
| ~ Business Checking | ~ Commercial Loans | ~ Collections |
| ~ Personal Checking | ~ Collateral Loans | ~ Foreign Remittances |
| ~ Time Deposits | ~ SBA Loans | ~ Wire Transfers |
| ~ Savings Accounts | ~ Mortgages | ~ Safe Deposit Boxes |
| ~ IRA Accounts | ~ Letters of Credit | ~ Traveler Checks |
| ~ Money Market Accounts | | ~ Cashier's Checks |

Visit our convenient locations

Manhattan
99 Madison Avenue
New York, NY 10016
Tel: 212-532-4444

Queens
74-05/07 37th Avenue
Jackson Heights, NY 11372
Tel: 718-397-0890

Los Angeles
110 East, 9th St.
Los Angeles CA 90079
Tel: 213-362-1200

ریحانہ قمر جدید تر غزل کی ایک منفرد اور توانا آواز
ہیں اور ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں

خالد احمد

ریحانہ قمر اردو شاعری کے باغ کا ایک ایسا گل نودیدہ
ہے جس کی خوشبو دور تک اور دیر تک رہے گی

انجمن اسلام آباد

ریحانہ قمر کو لمحہ موجود کی شاعرات میں بلند مقام حاصل ہے

مہاسین

تازہ لہجے کی خوبصورت

شاعرہ ریحانہ قمر کا

تیسرا شعری مجموعہ

ہم پھر نہ ملیں شاید

شائع ہو گیا ہے

الرزاق پبلی کیشنز

110 عرفان چیمبرز

130 ٹیلی روڈ لاہور

فون 7238501

LONGINES

L'ELEGANCE DU TEMPS DEPUIS 1832

SWISS MADE

Longines
DolceVita



73-15 Broadway
(Corner of 73rd St. & Broadway)
Opp. Long Island Savings Bank
Jackson Heights, NY 11372
TEL: (718) 803-0288

مُون
MOON
Jewelry